آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2019

www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

عالمی
یوم خواتین
مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

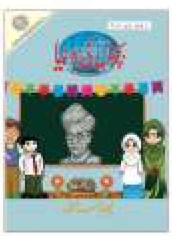

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

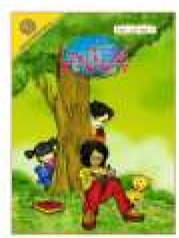

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

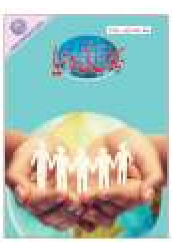

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	باجی جمال النساء، حیدرآباد کی ایک اولوالعزم خاتون	ڈاکٹر آمنہ تحسین	5
	پریم لتا اگروال: ماؤنٹ ایوریسٹ پر......	شیخ شوکت ندوی	12
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		13
عالمی یوم خواتین	وہ منزل ابھی نہیں آئی	عذرا نقوی	14
	عورتوں کے مسائل اور ہمارا معاشرہ	نسرین بیگم (علیگ)	17
	عالمی مسائل نسواں: ایک تجزیہ	ناز آفرین	23
جہان نسواں	مادری زبان کی اہمیت اور والدین کی ذمہ داریاں	گلشن آرا	29
	عصر حاضر کے اردو افسانوں میں نسائی......	محمد نہال افروز	32
کہانیاں	گھر کا چراغ	خلیق النساء	37
	اپنا عکس	ترنم جمال	39
	رشتہ	محمد قیوم میو	42
	اوقات	عرفانہ تزئین شبنم	44
	مہنگا اولڈ ایج ہوم	مہوش نور	47
حسن سخن	ڈاکٹر رام داس، محمودہ خانم، شیخ صابرالدین نورالدین		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان	ارم نعیم	53
صحت	سروائیکل کینسر: رحم (Uterus) کا ایک اہم کینسر	ڈاکٹر احسان رؤف	55
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

جلد: 3 شمارہ: 3 مارچ 2019

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

8 مارچ کو ہم یوم خواتین مناتے ہیں اور پورے جوش وخروش کے ساتھ اس موقع پر ادبی سرگرمیاں بھی عالمی پیمانے پر ہوتی ہیں۔ عورت کتنی فعال اور اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئی اس پر غور وفکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن حقوق نسواں کے حوالے سے ہر سال کچھ اہم سوالیہ نشان ہمیں دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔

عورتوں کی نمود معاشرے کے لیے مثبت عمل ہے۔ خدا کی سب سے بہتر اور خوبصورت عطا دنیا میں عورت کا وجود ہی ہے۔ عورت نہ ہو تو اس جہاں میں کوئی رونق باقی نہیں رہے گی۔ 'وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ' خواتین کے وجود سے انکار تو معاشرے کو نہیں ہے لیکن اس کی ذات کا ادراک اس طرح نہیں ہوا جس طرح سے ہونا چاہیے تھا۔ معاشرے نے عورت کے وجود کو تسلیم تو کیا لیکن اس کے کچھ حقوق سلب بھی کر لیے۔ وہ حقوق کیا ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اور آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ خواتین کی حق تلفی کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ ان کے ساتھ یہ رویہ ایک زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن یہ خوش آئند بات ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ خواتین اپنے حقوق کے تئیں بہت حساس ہوگئی ہیں۔

آئین میں خواتین کے لیے کچھ حقوق مختص ہیں لیکن بہت سی خواتین پڑھی لکھی نہ ہونے کے سبب اپنے حقوق سے ناواقف اور محروم ہیں۔ خواتین کے ساتھ تشدد آمیز رویہ اس لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ تعلیم سے نابلد ہوتی ہیں۔ اس رویے کے خلاف کوئی احتجاجی پیش رفت نہیں ہوتی اس لیے ان کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں اور وہ کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہیں۔ ہمیں اس پر بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کے سلسلے میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں بہت سے اہم کام کیے جارہے ہیں۔ عورت جہاں آٹھ سے بارہ گھنٹے کام کرتی ہے وہاں خواتین کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ اس ضمن میں بھی سرکاری تنظیمیں کام کررہی ہیں۔

عورت کو جن بے جا اور فرسودہ روایتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ معاشرے کی ہی دین ہیں۔ مثلاً جہیز جیسی فرسودہ روایت کا خاتمہ ابھی تک نہیں ہو پایا ہے بلکہ کہیں کہیں اس کا دائرہ پھیلتا ہوا نظر آرہا ہے۔ جبکہ جہیز مخالف قانون بہت پہلے پاس ہو چکا ہے لیکن اس ضمن میں عملی اقدام نہیں ہو سکا ہے۔ رحم مادر میں جنین کی جنس کا مسئلہ بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ جس کی وجہ سے عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں بہت سی خواتین اپنی جان تک گنوا دیتی ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ وہ جنین کشی کے مرحلے سے بھی گزرتی ہیں۔ یہ عمل شہروں کے مقابلے دیہی علاقوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ عورت کے لیے اتنے قوانین بن جانے کے بعد بھی ہمارے سامنے آئے دن ایسی صورت حال آتی ہے کہ ہم گھڑی بھر افسوس کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتے۔

عورت ایک طرف ہمارے لیے دیوی کا درجہ رکھتی ہے لیکن دوسری طرف ہم اس کی قدر دانی کے منکر ہوتے ہیں۔ عورت بیک وقت معاشرے میں بہت سے کردار انجام دیتی ہے۔ ماں، بیٹی، بہن، بیوی اس کے مختلف روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہمیں اس کی عظمت واہمیت کا پاس رکھنا ہوگا تبھی ایک مکمل اور بہتر معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ اگر ہم عورت کی اہمیت سے انکار کریں گے تو گویا ہم سماج کے ایسے حصے کو نظر انداز کر رہے ہیں جس کی ترقی سماج کی ترقی ہے، جس کا انحطاط سماج کو تنزلی کی طرف لے جائے گا۔ ہمیں اس کو معاشی سطح پر فعال بنانا ہوگا۔ ساتھ ہی اس کے منفعت بخش وجود کا اعتراف بھی کرنا ہوگا۔ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں تعلیم اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ اس کو گھر اور گھر کے باہر تحفظ فراہم کرنا ہوگا۔ عورت کے مثبت وجود کو اب نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خواتین کو بااختیار بنائیں اور ہر شعبے میں ان کی شمولیت کو یقینی بنائیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خواتین کے لیے جو بھی اسکیمیں ہیں انھیں نافذ کیا جائے، ان کے بارے میں خواتین کو بیدار کیا جائے۔ خواتین کو بھی یہ بات سمجھنی ہوگی اور اپنے تابناک وجود کے لیے، اپنی شناخت کے لیے اور اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے بیدار ومتحرک ہونا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ عورت میں قوت ارادی نہیں ہوتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی ترقی کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ اپنے ملک کی تمام خواتین کے بارے میں ہم ایک ہی رائے نہیں رکھ سکتے۔ کچھ ایسی بھی خواتین ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں اپنی موجودگی درج کرا رہی ہیں۔ پسماندہ خواتین کی طرف ہمیں زیادہ توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ ان میں تعلیمی بیداری لانی ہوگی تبھی وہ فعال بن سکتی ہیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہیں۔ 'خواتین دنیا' کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ رسالے پر اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

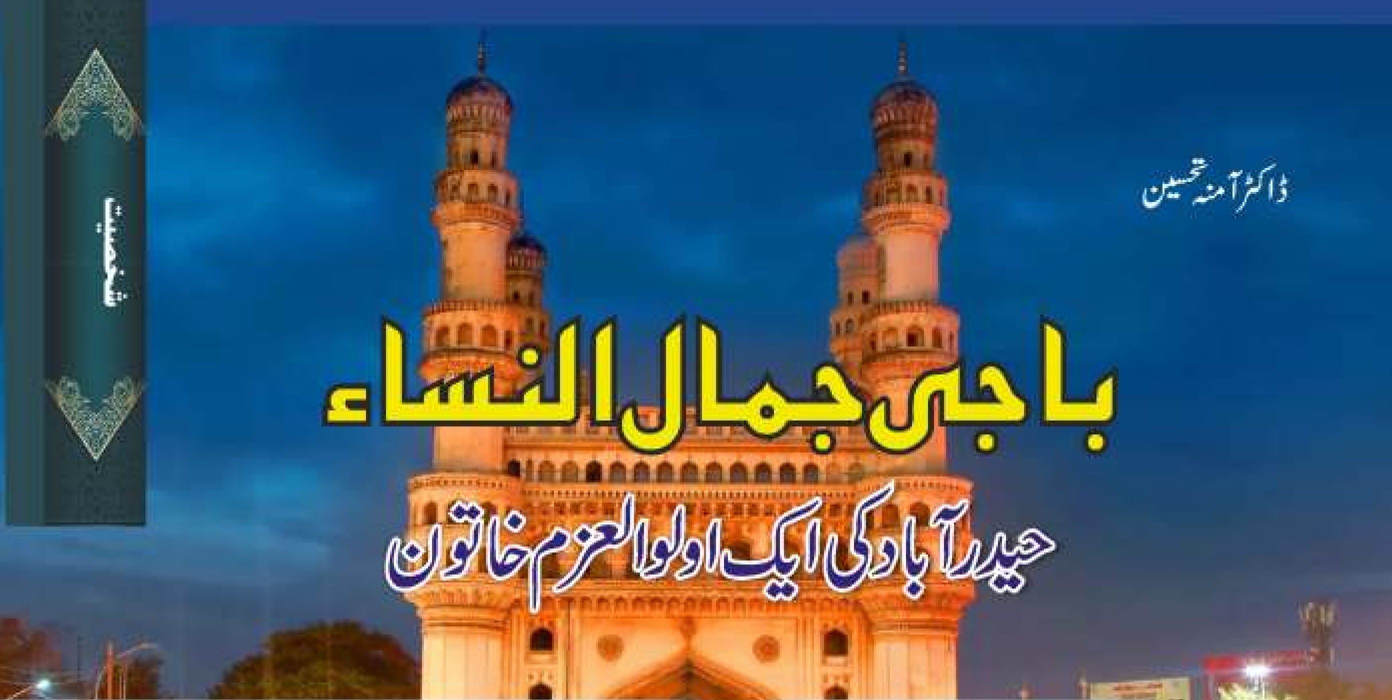

ڈاکٹر آمنہ تحسین

باجی جمال النساء

حیدرآباد کی ایک اولوالعزم خاتون

جمال النساء (پیدائش 1913، وفات 2012، حیدرآباد)، علمی وادبی ذوق کی حامل، سیاسی وسماجی شعور رکھنے والی فعال ونہایت بہادر اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ وہ ''باجی جمال النساء'' کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ انھوں نے کافی طویل عمر پائی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ نہ صرف خواتین کی ترقی وبااختیاری کے لیے وقف کردیا تھا بلکہ زندگی کے کئی برس سیاسی سرگرمیوں کی نذر کردیے تھے اور نہایت اہم اور قائدانہ رول نبھایا تھا۔ اگرچہ ادبی میدان میں ان کی خدمات زیادہ نہیں رہیں لیکن ان کی تحریر کردہ صرف ایک تصنیف ''بکھری یادیں'' باجی جمال النساء کی ادبی لیاقت کو منوانے نیز اس کتاب کی سماجی وسیاسی اور تہذیبی اہمیت کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مختلف شعبہ ہائے حیات میں باجی جمال النساء کی بھرپور حصّہ داری کے باوجود صرف معدودے چند افراد ہی ان کی شخصیت اور کارناموں سے واقف ہیں جب کہ ان کی فعال زندگی کے تقریباً تمام گوشے گمنامی کی نذر رہیں۔

ریاستِ حیدرآباد میں آصف جاہی سلطنت کی مستحکم حکومت کی بناپر انگریزوں کے تسلط سے ہندوستان کی آزادی کی کوششوں اور تحریکوں کا بظاہر زیادہ اثر نہیں ہو پایا تھا جتنا کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں یا شہروں میں ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خفیہ طور پر حیدرآباد میں بھی ایسے کئی حامیان تیار ہوگئے تھے جو قومی نظریہ کے تحت نہ صرف انگریزوں کے تسلط بلکہ صدیوں سے چلے آرہے شاہی وجاگیردارانہ نظام سے بھی ملک کی آزادی کے متمنی تھے۔ ان میں بڑی تعداد کمیونسٹ نظریات وعوامی حکومت کے حامی افراد کی تھی۔ اس حقیقت سے بھی تقریباً سب ہی ہندوستانی واقف ہیں کہ جنگِ آزادی دو محاذوں پر لڑی گئی۔ ایک طرف گاندھی جی کے عدم تشدد والے نظریات کے حامی آزادی کے متوالے تھے تو دوسری طرف متوازی طور پر ہندوستان کی آزادی کو لے کر بایاں بازو کی پرجوش وسرخ انقلاب کی تحریک بھی زوروں پر تھی اور بہت سے افراد اس تحریک سے وابستہ ہورہے تھے جن میں مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کے علاوہ ادبا وشعرا بھی شامل تھے۔ اسی دوران ہندوستان میں ''ترقی پسند مصنفین'' کے قیام نے زبان وادب کے ذریعہ سماجی حقائق کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بایاں بازو کے نظریات کو بھی خوب فروغ دیا۔ ''ترقی پسند مصنفین'' کے کارواں میں ہردن اردو کے بشمول تقریباً ہندوستانی زبانوں کے اہلِ قلم افراد کی شمولیت ہوتی رہی اور یہ کارواں بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ حب الوطنی اور آزادی کے جوش سے بھرپور تحریریں منظرِ عام پر آتی رہیں، جو سماج کی ذہن سازی نیز حب الوطنی کے جذبوں کو جلا بخشنے کا کام کرتی رہیں۔ قومی سطح پر سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات کہیں نہ کہیں ریاستِ حیدرآباد کے معاشرے پر بھی مرتب ہوتے رہے۔ لہٰذا انگریزوں سے ملک کی آزادی اور جاگیردارانہ نظام کی مخالفت میں آہستہ آہستہ چند ایک افراد قومی تحریکوں اور مختلف تنظیموں سے وابستہ ہوتے گئے۔

ریاستِ حیدرآباد میں ملک کی آزادی کے نظریہ کو لے کر تحریکات میں حصّہ لینے والوں میں مردوں کے مقابلے خواتین کی تعداد نہایت کم تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حیدرآباد کے سخت روایتی وتہذیبی اور جاگیردارانہ ماحول میں اگرچہ خواتین کی تعلیم وترقی کو لے کر مختلف سطحوں پر

کوششیں شروع ہوگئی تھیں لیکن وہ تمام تر کوششیں مخصوص نظریات اور ہدایات کی پابند تھیں۔ ایسے سماجی وتہذیبی ماحول میں ملک کی آزادی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانا یا اس نظامِ حکومت کی تبدیلی کی کوشش کرنا یا قومی سیاست کا حصہ بننا خواتین بالخصوص مسلم خواتین کے لیے نہایت مشکل امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں سیاسی سطح پر متحرک مسلم خواتین کی تعداد بہت کم نظر آتی ہے۔ ایسے ذہنی، سماجی وسیاسی بندشوں کے دور میں جمال النساء کمیونسٹ تنظیم کے ابتدائی دور سے ہی وابستہ ہوئیں اور مختلف سرگرمیوں میں نہایت فعال رہیں۔ انھوں نے ریاستِ حیدرآباد کی سماجی، سیاسی، ادبی وتہذیبی زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ ملک کی آزادی (1947) اور سقوطِ ریاستِ حیدرآباد (1948) سے قبل کے سیاسی وسماجی حالات، پھر بعد میں رونما ہوئی تبدیلیوں کی وہ نہ صرف چشم دید گواہ تھیں بلکہ ان تبدیلیوں کا وہ خود بھی ایک اہم حصہ تھیں۔ حیدرآباد میں ان کا مکان مختلف سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔ جہاں بے شمار سیاسی وادبی شخصیتوں نے مل کر اپنے فکر وخیال کو نہ صرف مہمیز کیا تھا بلکہ سماجی سطح پر بیداری وتبدیلیوں کے لیے سرگرم ماحول تیار کیا تھا۔ آزادی ہند، سقوطِ حیدرآباد اور تلنگانہ تحریک کے دوران ہتھیار بند لڑائی کے لیے حکمت عملیوں کی تیاری، جہدکاروں کی روپوشیوں اور ہتھیار کے ذخیرہ کے لیے جمال النساء کا مکان اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک باحوصلہ و بہادر لیڈر کی طرح جمال النساء نے ان سب کارکردگیوں میں موثر رول ادا کیا تھا۔

جمال النساء کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے ہم متعارف نہیں ہو پاتے اگر وہ خود اپنی زندگی اور اپنے عہد کی تمام تفصیلات کو رقم نہ کرتیں۔ جمال النساء نے اپنی یادوں میں محفوظ بے شمار خاندانی، سماجی، ادبی وسیاسی واقعات کو ''بکھری یادیں'' کے عنوان سے تحریر کیا اور اسے کتابی شکل دی جو 2008 میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ جمال النساء نے اگرچہ اس کتاب کو ہیئت کے اعتبار سے ''یادداشت'' کا نام دیا ہے اور ذیلی عنوانات کے تحت مختلف حالات اور واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن 243 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنفہ کی طویل زندگی کے شب وروز، ان کی ظاہری و باطنی شخصیت، حیدرآباد کی مکمل معاشرتی تاریخ، مختلف علاقوں کی تفصیلات، سیاسی وادبی سرگرمیوں کے علاوہ کئی ایک سیاسی وادبی شخصیتوں کی زندگیوں سے بھی متعارف کرواتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے ذریعہ دیگر ممالک کی سیاسی وسماجی اور تہذیبی تاریخ کے بھی اہم گوشوں سے ہمیں تعارف حاصل ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے واقعات کا تسلسل اور بہتر انداز میں پیش کشی کی بنا پر یہ

''جمال النساء کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلو وئوں سے ہم متعارف نہیں ہو پاتے اگر وہ خود اپنی زندگی اور اپنے عہد کی تمام تفصیلات کو رقم نہ کر تیں۔ جمال النساء نے اپنی یاد وں میں محفوظ بے شمار خاندانی، سماجی، ادبی و سیاسی و اقعات کو ''بکھری یادیں'' کے عنوان سے تحریر کیا اور اسے کتابی شکل دی جو 2008 میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ جمال النساء نے اگر چہ اس کتاب کو ہیئت کے اعتبار سے ''یادداشت'' کا نام دیا ہے اور ذیلی عنوانات کے تحت مختلف حالات اور واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے''

''یادداشت'' ایک مکمل اور جامع خودنوشت سوانح معلوم ہوتی ہے جس میں نہ صرف قومی بلکہ ریاستِ حیدرآباد کی تاریخ وتہذیب کے کئی پوشیدہ گوشے اور ان سنی داستانیں محفوظ ہوگئی ہیں۔

''یادداشت'' (Memoir) '' دراصل جدید ادبی صنف ہے جو مغربی زبانوں کے ادب میں بہت مقبول ہے۔ ویب سٹر ڈکشنری کے مطابق ''یادداشت'' دراصل خودنوشت سوانح سے کچھ مختلف تحریر ہوتی ہے جس میں مصنف اپنے حالات وواقعات کو یادوں اور مشاہدات کی بنیاد پر مختلف عنوانات کے تحت مختصر طور پر تحریر کرتا ہے۔ آپ بیتی، یادداشتیں، روزنامچے، خودنوشت سوانح عمری، غیر افسانوی ادب کی اہم ترین اصناف ہیں۔ ان تحریروں کا شمار سوانحی ادب میں ہوتا ہے۔ اس صنفِ ادب کے ذریعہ نہ صرف مصنف کی خاندانی ونجی تفصیلات، نظریات اور ذہنی وفکری نشوونما کو سمجھا جاسکتا ہے بلکہ ان تحریروں میں مصنف کے دور کے تمام سیاسی، سماجی وتہذیبی حالات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مبسوط اور بہتر طریقہ سے لکھی گئی آپ بیتی، یادداشتیں، روزنامچے، خودنوشت سوانح عمریاں ایک ''نجی تحریر'' ہونے کے باوجود مخصوص دور کی معاشرتی تاریخ بن جاتی ہے۔ اس صنفِ ادب میں سوانح نگار اپنی یادداشت اور مشاہدات کی بنیاد پر جہاں اپنی زندگی کے متعلق داخلی وخارجی حالات اور واقعات نیز دیگر تفصیلات رقم کرتے ہیں وہیں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنے ہم عصر

افراد کے افکار و افعال بھی رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بالواسطہ طور پر گویا ایک مکمل معاشرتی تاریخ منصۂ شہود پر آجاتی ہے۔ جیسا کہ عمر رضا لکھتے ہیں:

"سوانحی تحریروں سے کسی بھی ملک کے خاص عہد، سماج اور دیگر حالات واقعات کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانحی ادب کی تاریخی، سماجی وثقافتی، نفسیاتی، اخلاقی اور جمالیاتی اہمیت و افادیت ایک مسلمہ حقیقت بن جاتی ہے۔"[1]

اس ضمن میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا خیال ہے کہ:

"کسی بھی بڑے آدمی کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی۔ اس کا ماحول اور اس کے ماحول سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں اور ایک سوانح عمری کا مطالعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کی ہی زندگی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس سے وابستہ بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ ہے۔ جس میں تاریخ وتہذیب دونوں ہی سمٹ آتے ہیں"[2]

اردو میں آپ بیتی، یادداشتیں، روزنامچے، خودنوشت سوانح عمریاں لکھنے کا آغاز 1857 کے بعد ہوتا ہے۔[3] اگرچہ 1857 کے بعد جدید اردو نثر کی کئی اصناف وجود میں آئیں اور تیزی سے ان کا فروغ ہوتا گیا لیکن سوانحی ادب کی رفتار نسبتاً کم نظر آتی ہے۔ جبکہ سوانحی ادب میں بالخصوص خودنوشت یا آپ بیتیوں کی تعداد دیگر تحریروں کے مقابلے میں نہایت کم قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کا سماجی وتہذیبی ماحول کسی فرد یا اس کے ہم عصر افراد کے متعلق حقائق کے اظہار کے لیے بڑے عرصے تک سازگار نہیں رہا۔ اس نوعیت کی تحریریں "نجی تحریر" میں شمار ہوتی تھیں لہٰذا انھیں منظرِ عام پر لانے سے بھی گریز کیا جاتا رہا۔ ابتدائی دور کی جو تحریریں منظرِ عام پر آئیں ان میں مصنف کی زیادہ تر توجہ اس دور کے مخصوص کارناموں یا اہم واقعات تک رہی۔ ان تحریروں میں خود مصنف کے متعلق حقیقت بیانی سے گریز کے رویے کو بھی بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ دراصل خود اپنی شخصیت سے متصادم ہونا اور مکمل حقیقت بیانی سے کام لے کر اپنا اور اپنے عہد کا خاکہ صفحۂ قرطاس پر من وعن اتار دینا کسی بھی مصنف کے لیے مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خودنوشت یا آپ بیتی میں مصنف کا اپنی باطنی شخصیت پر کھل کر اظہار خیال عنقا ہوتا ہے۔ جیسا کہ مقبولِ عام شاعرہ وادیبہ کشور ناہید لکھتی ہیں:

"شاعری کرنا اور بات ہے اور اپنے بارے میں لکھنا اور۔۔۔ کسی بھی فنکار یا قلم کار کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے جب وہ اپنے بارے میں قلم اٹھاتا ہے"[4]

تاہم حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سے اردو کی شعری ونثری اصناف میں وقت کے ساتھ ساتھ ہیئت، اسلوب وتکنیک میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی طرح اس صنفِ ادب یعنی خودنوشت سوانح عمریوں کے خدوخال بھی بدلتے گئے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں چند ایک بہترین خودنوشت سوانح لکھی گئیں جنھیں ہم تاریخ، تہذیب اور ادب کے حوالے سے ایک اہم ماخذ قرار دے سکتے ہیں۔ نثر کی اس اہم صنفِ ادب کی باقاعدہ ابتداء کو تقریباً ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہو گیا لیکن اردو زبان میں یہ ادبی سرمایہ کمیت کے اعتبار سے آج بھی کم ہی نظر آتا ہے۔

سوانحی ادب کے اس تناظر میں جب ہم خواتین کی تحریر کردہ "یادداشتوں یا خودنوشت سوانح عمریوں" کا جائزہ لیتے ہیں تو اور بھی خراب صورتحال واضح ہوتی ہے۔ مردوں کی بہ نسبت اردو میں خواتین کی تحریر کردہ آپ بیتیوں یا خودنوشت کی تعداد نہایت ہی کم ہے۔ اگرچہ چند ایک خواتین نے اردو میں خودنوشت لکھی ہیں لیکن ان کے متعلق معلومات بھی کم ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر جو تحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں بہ مشکل کچھ خواتین کے نام شامل کیے گئے ہیں۔ جبکہ سوانحی ادب کی تاریخ کا نہایت گہرائی سے جائزہ لیں تو ایک حیرت انگیز حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ جہاں مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف "تواریخِ عجیب" بہ موسوم "کالا پانی" اور عبدالغفور نساخ کی تصنیف "سوانح عمری" کو اردو کی اولین خودنوشت سوانح قرار دیا گیا ہے جو بالترتیب 1884 اور 1887 میں لکھی گئیں وہیں اسی دور میں شہر بانو بیگم (دختر نواب اکبر علی خاں رئیس پاٹودی) کی 1887 میں تحریر کردہ خودنوشت "بیتی کہانی" کے متعلق کہیں ذکر نہیں ملتا۔ 89 صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کو شہر بانو بیگم نے ایک انگریز خاتون مس فلیچر کے کہنے پر 1885 سے رقم کرنا شروع کیا اور 1887 میں مکمل کرلیا اور ایک دیباچہ کے ساتھ اسے کتابی شکل دے دی۔ 1857 کے بعد کے حالات پر مشتمل یہ مختصر سی خودنوشت کئی ایک اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس نایاب اور کم یاب خودنوشت کو معین الدین عقیل نے 1985 میں مرتب کیا اور پاکستان سے شائع کیا۔[5]

جیسا کہ پچھلی سطور میں تحریر کیا گیا کہ "خودنوشت، یادداشتیں، یا آپ بیتی" ایک ایسی تحریر ہے جس میں ادیب اپنی ذات، اپنے تجربات اور

مشاہدات کو ادب کے کینوس پر اتارتا ہے۔اس تصویر کشی میں تاریخ، تہذیب، سیاسی وسماجی مناظر بھی قید ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ادیب کا اپنا ایک زاویہ نگاہ ہوتا ہے جس سے وہ خود کو اور اپنے عہد کے واقعات وسماج کو دیکھتا ہے۔اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں مرد ادیبوں کا اپنا ایک منفرد ادراک اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے ویسے ہی خواتین کے مشاہدات اور حالات وواقعات کے تئیں ان کا اپنا احساس ورد عمل مختلف وجداگانہ ہوسکتا ہے۔ جو بہ حیثیتِ بنی نوع انساں کے نہایت اہم ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی سماج ومعاشرہ کی تصویریں جو خواتین کے قلم سے کھینچی گئی ہوں وہ تصویریں منفرد زاویہ نگاہ ہونے کی بنا پر اور بھی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ چونکہ خودنوشت، یادداشتیں، یا آپ بیتی صرف اپنے عہد کی معاشرتی تاریخ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں خواتین کا اظہار ذات بھی شامل ہوتا ہے۔ نیز ان تحریروں میں کئی ایک واقعات یا بین السطور میں موجود احساسات وجذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔لہٰذا، ان تحریروں کا مطالعہ وتجزیہ ہندوستانی سماج کے ڈھانچے، خواتین کے متعلق تصورات ونظریات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں کسی خاص عہد کے مطالعہ یا بازیافت کے لیے ان تحریروں کو اہم ترین ماخذ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔اردو کے حوالے سے صرف چند خودنوشت نگار خواتین کے نام دستیاب ہیں ان میں باجی جمال النساء ایک اہم نام قرار دیا جا سکتا ہے۔ جمال النساء نے اپنی کتاب ''بکھری یادیں'' میں بڑی غیر جانبداری سے نہ صرف اپنے عہد کے تمام حالات کو رقم کیا ہے بلکہ اپنی شخصیت کو مختلف پرتوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے نہایت سادہ وسلیس انداز میں تمام حقائق کو صفحات پر بکھیر دیا ہے۔ جمال النساء'' بکھری یادیں'' تحریر میں آنے کے اسباب یوں لکھتی ہیں، ملاحظہ کیجیے:

''ایک دور ایسا بھی آیا کہ راتوں کی نیند غائب۔ پرانی یادوں اور باتوں کی جیسے ایک فلم ہر وقت نظروں کے سامنے۔ خالی بیٹھے بیٹھے سوچا، ان یادوں کو قلمبند کر دوں تو شاید کچھ وقت ہی کٹے اور دماغ کو سکون ملے۔ یوں اختر کے جانے تک کی ساری یادیں نہ جانے کیسے لکھ ڈالیں۔ یہ مسودہ پڑا ہوا تھا۔ ایمن اور ذکیہ کا اصرار کہ اختر کے بعد سے اب تک کے حالات بھی لکھوں۔۔۔۔ وہ بھی جیسے تیسے لکھ ڈالے۔''6

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب دو مختلف وقتوں میں لکھی گئی۔ یعنی جمال النساء کے بھائی اختر حسن کے انتقال تک وقوع پذیر واقعات کو قلمبند کرنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ بعد میں کچھ اور یادوں کو اس کتاب میں شامل کیا گیا۔ تاہم بعد کا تحریر کردہ حصہ نہایت مختصر ہے جبکہ پہلے دور میں لکھی گئی تحریر برسوں پر محیط اہم واقعات وتفصیلات پر مبنی ہے۔

جمال النساء کے دادا اور والد چونکہ روزگار کے سلسلہ میں مختلف اسٹیشنس پر خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ انھیں دور دراز کے مقامات اور دیہاتوں میں قیام کرنا پڑتا جہاں تعلیمِ نسواں کا کوئی نظم نہیں تھا۔لڑکیوں کی تعلیم گھر پر ہی ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا حسب روایت جمال النساء کی تعلیم گھر پر ہی ہوتی رہی۔ جبکہ ان کے بھائیوں کو شہرِ حیدرآباد میں رکھ کر تعلیم دلوائی گئی۔ البتہ کچھ عرصہ بعد جب وہ سب حیدرآباد منتقل ہو گئے تو ان کی بہنوں کو بھی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ان کے والد کے اس اقدام پر خاندان کے افراد کی جانب سے خوب مخالفت کی گئی۔لیکن ان کے والد نے تمام مخالفتوں کے برخلاف لڑکیوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔ذیل کے اقتباس میں تعلیمِ نسواں کے متعلق اس دور کے نظریات کے ساتھ ساتھ قدیم وجدید خیالات کے حامل افراد کے ٹکراؤ اور بدلتے رجحانات کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جمال النساء ''بکھری یادیں'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''چچا میاں تو پہلے ہی بھائی سے ناراض تھے کہ بچوں کو اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ایک دن ملنے آ گئے۔ رضیہ، رابعہ کو ایک ہندو نوجوان طالبِ علم سے حساب وغیرہ سیکھتے دیکھ کر زور سے اِن للہ پڑھا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔۔۔۔ ایک دن آستین چڑھا کر ابّی سے لڑنے ہی آ گئے تم کیا بے ہودہ حرکت کر رہے ہو۔ لڑکیوں کو اسکول کیوں بھیج رہے ہو۔ رضیہ ریڈیو پر مضمون پڑھتی ہے۔ نامحرم اس کی آواز سنتے ہیں۔۔۔ ابّی حسب عادت خاموش باتیں سنتے اور مسکراتے رہے''7

اس وقت تک چونکہ جمال النساء سنِ بلوغت میں داخل ہو چکی تھیں اسی لیے انھیں باقاعدہ اسکول کی تعلیم کا موقع فراہم نہیں کیا جا سکا۔ جب کہ ان کی بہنوں رضیہ اکبر، رابعہ برنی اور ذکیہ عادل کو باقاعدہ تعلیم کا موقع ملتا رہا اور انھوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ رضیہ اکبر تہران یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد شعبہ فارسی' جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئیں اور درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ ان کی دوسری بہنیں، رابعہ برنی اور ذکیہ عادل نے بھی اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کی۔ جمال النساء کو اگرچہ تعلیم کے حصول کا موقع میسر نہیں آیا تھا لیکن انھیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ گھر پر اردو کی کتابیں اور کئی ایک رسائل انھیں پڑھنے کو مل جاتے۔ جن کے مطالعہ سے ان کے علم اور ادبی ذوق میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں ان کی فکر بالیدہ ہونے لگی اور اظہار کے لیے منفرد راہ تلاش کرنے لگی۔ جمال النساء کی ذہنی وفکری نشو ونما کی ابتداء ان ہی کے

الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

''آپا (پھوپی زاد بہن) نے میرے نام'' تہذیب نسواں'' جاری کروادیا تھا۔ مطالعہ کا شوق تبھی سے تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ اب تو بس اتنا یاد ہے کہ اس میں شوہر کو کیسے رام کریں۔ ساس سسر سے کیسے برتاؤ کریں وغیرہ قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ جن کے بارے میں مجھے نہ کوئی علم تھا نہ جاننے کی فکر یا دلچسپی۔''[8]

اگر چہ اس دور میں لڑکیوں کی پرورش اور ایک ''بہترین خاتون خانہ'' والی شخصیت کی تشکیل کے لیے اسی طرح کا ادب لکھا جاتا تھا۔ لیکن درجہ بالا مذکورہ سطور سے یہ اندازہ بھی بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اسی دور میں روایتی اصول وضوابط اور طور طریقوں سے بیزار اور انحراف کرنے والے ذہن بھی تیار ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جمال النساء کو حصولِ تعلیم کے لیے باقاعدہ سازگار ماحول نہ ہونے کے باوجود ان کی شخصی، ذہنی وفکری نشوونما کی انفرادیت کو کوئی روک نہ سکا۔ مطالعہ کے شوق میں جمال النساء نے ڈھیر ساری کتابیں پڑھ لیں حتیٰ کہ انھوں نے اپنے بہن بھائی کی مدد سے انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور بہت جلد War and- Peace ,Anna Karenina - جیسے ناول بھی پڑھ ڈالے۔ جمال النساء کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آیا تھا لیکن کئی برسوں بعد انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی، محنت اور لگن سے گھر بیٹھے تیاری کی اور منشی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ اخبارات ورسائل میں معارف، نگار، خیالستان، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ساقی، ادیب، ایشیا، پیام، رہبر وغیرہ کا مطالعہ ان کے شب وروز میں شامل تھا۔ خصوصاً رسالہ نگار سے وہ بہت زیادہ متاثر تھیں اس رسالہ سے وابستگی کی بنا پر تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ جیسا کہ وہ لکھتی ہیں:

''سلیم چچا کے مشورہ سے نگار کی خریدار بن گئی۔ سن 28ء سے 47ء تک مستقل طور پر خریدار رہی۔ نہ صرف میرے بلکہ بھی بھائی بہنوں کی فکری تربیت وتعمیر میں اس رسالہ اور نیاز فتح پوری کی نگارشات کا بہت حصہ ہے۔۔۔۔ اجتناہی میں تحریکِ آزادی سے متاثر ہو کر اور تو کچھ نہ کرسکتی تھی بس سودیشی پہننے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔''[9]

دراصل جمال النساء کی شخصیت کی بھرپور نشوونما اور فکر ونظر کی بالیدگی نیز سیاسی معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے میں ان کے گھریلو ماحول نے اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں:

''گھر میں گاندھی جی، نہرو، محمد علی اور حسرت موہانی وغیرہ کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اخباروں کے مطالعے نے میری سوجھ بوجھ میں اضافہ کیا بلکہ میرے شعور وفکر کی تشکیل بھی ہوئی۔ ساتھ ہی میری اپنی ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی بننے لگی۔۔۔۔ اس دوران سیاست سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ جن مشہور لیڈروں کے نام اخباروں میں پڑھتی ان کے ساتھ کام کرنے اور ملنے کو دل چاہتا تب ایک ہی خواہش تھی کہ آزادی کی لڑائی میں شریک ہوسکوں۔''[10]

ابتدائی برسوں میں ملک کی آزادی کی تحریک میں شمولیت کی خواہش اتنی شدید تھی کہ جمال النساء اپنی عیدی کی رقم جمع کرتیں تاکہ قومی فنڈ میں اسے دے سکے۔ کسی لیڈر کے آنے کی اطلاع ملتی تو پورے پردہ کے اہتمام کے ساتھ اپنے بھائی کے ہمراہ ہولیتیں اور اپنی جمع شدہ رقم ان کے حوالے کردیتیں۔ اسی ضمن میں مولانا محمد علی جوہر ان کی بیگم اور دیگر قومی لیڈران سے ملاقات کا انھیں موقع ملا۔ اگرچہ قومی لیڈران کی تمام سرگرمیوں سے وہ روشناس تھیں اور کچھ افراد کی معترف بھی، لیکن ملک کی آزادی کے متعلق ان کی اپنی رائے اور قائدانہ کوششوں کو لے کر ان کا اپنا ایک خاص نظریہ بننے لگا تھا۔

شوقِ مطالعہ، گھر کے سیاسی ماحول کے علاوہ ان کے بھائی اختر حسن کی سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے اثرات بھی جمال النسا کی شخصیت پر بڑی حد تک مرتب ہوتے رہے۔ لہٰذا سیاسی معاملات کو لے کر ان کا ذہن پختہ ہوتا گیا۔ بچپن سے ہی تمام بھائی بہن اختر حسن کی نگرانی میں گھر پر ادبی محفلیں سجاتے، شب ماہ منعقد کرتے، بیت بازی، کہانیاں اور مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرتے، سیاست پر مباحثے رکھے جاتے۔ دیواری رسالہ ''ماہوار پریم گزٹ'' کی اشاعت بھی ان کی سرگرمیوں میں شامل تھی۔ چونکہ اختر حسن کا ادبی حلقہ کافی وسیع تھا جس میں ترقی پسند قلم کار اور نامور صحافی شامل تھے۔ لہٰذا وہ اپنے ساتھی ادیبوں اور شعرا کو ان کی بیگمات کے ساتھ گھر پر مدعو کرتے اور مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے۔ حیدرآباد آنے والے نامور ادیب وشاعروں میں شاید ہی کوئی ایسے افراد ہوں گے جو جمال النساء کے گھر مہمان نہ ہوئے ہوں۔ عرصہ تک حیدرآباد میں مخلوط محفلوں کا ماحول نہیں تھا۔ گھر پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں پہلے پہل تمام خواتین پردہ کے پیچھے بیٹھی سنا کرتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ماحول تبدیل ہونے لگا ان محفلوں میں خاص کر جمال النسا کی بہنیں رضیہ اور رابعہ بھی مضامین سنانے لگیں۔ گھر کا یہی ماحول اور یہ ادبی سرگرمیاں بعد

کے آنے والے دنوں میں اور بھی سازگار و تعمیری بنتے چلے گئے۔ کچھ ہی عرصہ میں جمال النسا کی بہنیں رضیہ اور رابعہ اچھی افسانہ نگار و مضمون نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئیں۔ ان کی تحریریں مجلہ عثمانیہ، پیام وغیرہ میں شائع ہوا کرتی تھیں جبکہ دونوں نے مل کر ایک ناول بھی لکھا تھا۔ بقول ان کے جو کہیں ضائع ہوگیا۔ اختر حسن کا شمار بھی اس دور کے دیدہ ور اہلِ قلم میں ہوتا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں سے سماجی بیداری اور سیاسی تحریک کو خوب تقویت پہنچائی۔ انھوں نے قاضی عبدالغفار کے بعد روزنامہ ''پیام'' کی ادارت سنبھال لی تھی۔ آزادی ہند اور ترقی پسند تحریک کی تاریخ میں ''پیام'' کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہ تمام بہن بھائی ترقی پسند نظریات کے قائل اور کمیونسٹ پارٹی کے حامی و سرگرم کارکن بن گئے تھے۔ وطن کی آزادی کے ساتھ ساتھ خواتین کی ترقی کے لیے کچھ کر گزرنے کی فکر اتنی شدید تھی کہ انھیں اپنی نجی زندگی سے بھی کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہوسکی۔ حالانکہ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی عزیزالدین سے ہوگئی تھی اور 1938 میں ان کے یہاں پہلا بیٹا جاوید ہوا۔ چند برس بعد انھوں نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تاہم صحت کی خرابی کے باعث یہ لڑکا جلد ہی انتقال کرگیا۔ عزیزالدین تعلیم یافتہ فرد تھے لیکن انھیں ملک کی آزادی یا دیگر ادبی، سیاسی و سماجی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جبکہ جمال النساء کی شخصیت اور فکر و خیال کی اڑان نے پہلے ہی اپنی راہ کا تعین کرلیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جمال النساء کے لیے ایک ''خاتونِ خانہ'' کی طرح زندگی گذارنے کا تصور بھی محال تھا جبکہ وہ خود کو ایک ''انقلابی مجاہدِ آزادی'' کے روپ میں دیکھ رہی تھیں۔

انھوں نے شادی شدہ زندگی سے جڑی تمام ذمہ داریاں نبھائیں اور ساتھ میں سیاسی و سماجی اور عملی زندگی کے لیے بھی خود کو وقف کردیا۔ دراصل انھیں اپنے شوہر عزیزالدین اور بھائی اختر حسن کی جانب سے وہ تمام تر مواقع ملتے رہے جس میں وہ اپنے ارادوں کو عملی شکل دے سکتیں۔ حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے قیام کے ابتدائی دور سے ہی وہ وابستہ ہوگئی تھیں اور دیگر خواتین یشودھا بہن اور رتائی، کملا دیوی، برج رانی وغیرہ کے ساتھ مل کر مختلف کام انجام دینے لگی تھیں۔ اسی دوران 1945 میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر نامور ادیب و شعرا سے انھیں ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے حوصلے مزید بلند ہونے لگے لہٰذا وہ پارٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ انھیں جلد ہی پارٹی کے اہم امور کا ذمہ دار بنادیا گیا۔ جس میں بظاہر انجام دی جانے والی سرگرمیوں کے علاوہ انگریزوں اور حکومتِ وقت کے خلاف خفیہ طور پر انجام دیے جانے والے مختلف کام بھی تھے۔

ان کاموں کی انجام دہی میں دیگر کامریڈز کے ساتھ اختر حسن اور مخدوم محی الدین پیش پیش رہا کرتے تھے۔ کامریڈز کی روپوشی کے دور کی تمام تر سرگرمیوں میں راست طور پر جمال النساء بھی شامل رہتی تھیں۔

سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ جمال النساء کی عملی زندگی کا اہم میدان ''خواتین کی تعلیم و بااختیاری'' تھا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں 1948 کا پولیس ایکشن بدترین دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے حیدرآباد میں حالات نہایت ہی ابتر ہوگئے تھے۔ بے شمار افراد معاشی طور پر مفلوک الحال و پریشان ہوگئے تھے۔ ایسے ماحول میں جمال النساء نے چند ہم خیال خواتین کے ساتھ مل کر ناخواندہ و غریب خواتین میں شعور بیداری اور تعلیم و ترقی کے لیے کام کرنا شروع کیا اور مختلف محلات اور جھونپڑ پٹیوں میں جاکر تعلیم دینے نیز اپنے گھر پر انھیں ہنر سکھانے کی شروعات کی۔ جس کے لیے انھیں سماجی سطح پر بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چند برسوں میں ماحول بہتر ہوتا گیا اور بے شمار خواتین اس مشن سے جڑتی چلی گئیں۔ جمال النساء نے غریب و مجبور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سوسائٹی ''حیدرآباد ویمنس انڈسٹریل سوسائٹی'' قائم کی تھی۔ تاکہ ان کے لیے منظم طریقہ سے کوششیں کی جاسکے۔ اس سوسائٹی کے تحت ہر برس نمائش منعقد کی جاتی جس میں خواتین کی جانب سے تیارشدہ اشیاء کی فروخت کا اہتمام کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ان کی حوصلہ افزائی کے لیے موقع بہ موقع ادبی و تہذیبی پروگرامس کا انعقاد بھی ہوا کرتا۔ جس سے سوسائٹی کے لیے فنڈ اکھٹا کیا جاتا۔ ہر برس 8 مارچ کو ''خواتین کا دن'' منایا جاتا۔ جس میں مخدوم محی الدین کے علاوہ بے شمار نامور قلم کاروں نے شرکت کی تھی۔ خواتین اور بچوں کے حقوق پر جلسے منعقد کیے جاتے۔ ریلیاں نکالی جاتیں۔ اردو اور دیگر زبان میں ورقیے تقسیم کیے جاتے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں خواتین تعلیم و ہنر سیکھنے کی طرف متوجہ ہوتی رہیں۔ روزافزوں ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

عالمی سطح پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ حرکیاتی خواتین نے ایک تنظیم ''ورلڈ ویمنس ڈیموکریٹک فیڈریشن'' بنائی تھی جو نہ صرف سیاسی معاملات بلکہ خواتین کی ترقی کے لیے مختلف سطحوں پر کارگر تھی۔ اسی نہج پر ہندوستان میں بھی 1945 میں ''انڈین نیشنل ویمنس فیڈریشن'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم کے لیے پینتالیس اہم ارکان پر مشتمل ورکنگ کمیٹی بنائی گئی تھی جس میں جمال النساء بھی شامل تھیں۔ اس فیڈریشن کے اولین جلسے حیدرآباد اور وجے واڑہ میں منعقد کیے گئے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری جمال النساء کے سر تھی۔ اپنی فعالیت سے جمال النساء نے اس تنظیم کی

کارکردگی میں جان ڈال دی تھی۔ اس کے تحت خواتین کی ترقی و سیاسی و سماجی شعور بیداری پر بے حد اہم کام انجام دیے گئے۔ جس کے نتیجے میں خواتین منظم اور متحد ہوکر اپنے حقوق کو جاننے لگیں اور ان کے حصول کے لیے ان میں شعور بھی بیدار ہوتا گیا۔ چند برسوں بعد یہ جلسے مختلف شہروں میں منعقد ہوئے۔ جس میں شرکت کے لیے جمال النساء نے مختلف مقامات کا سفر بھی کیا اور پروگراموں میں حصہ لیا۔ ملک کی آزادی کے بعد پارٹی کی جانب سے فیڈریشن سے وابستہ خواتین کے وفد کو روس، ازبکستان، تاشقند وغیرہ کے دورہ پر بھیجا گیا۔ اس وفد میں جمال النساء بھی شامل تھیں۔ انھیں لینن اور اسٹالن کی آخری آرام گاہوں پر جانے کا موقع دستیاب ہوا۔ اس سفر کی تفصیلات کو جمال النساء نے اپنی کتاب ''بکھری یادوں'' کا حصہ بنایا ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف وہاں کی تہذیب و تمدن کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ایک بہترین سفرنامے کے مطالعہ کا احساس بھی ہوتا ہے۔

جمال النساء کئی برسوں تک کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن رہیں لیکن بعد میں پارٹی سے ان کی دلچسپی اور وابستگی کم ہوتی گئی جس کی وجہ انھوں نے پارٹی سے وابستہ افراد کی آپسی رسہ کشی، اختلافات نیز بنیادی نظریات میں تبدیلی کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے پارٹی سے دوری اختیار کرلی۔ دوسری طرف پارٹی والوں نے بھی جمال النساء کی حصہ داریوں کو فراموش کردیا۔

''بکھری یادیں'' کے مطالعے سے قاری نہ صرف مجموعی طور پر جمال النساء کی فعال زندگی کے شب و روز نیز اس دور کی تمام معاشرتی زندگی سے بھرپور طریقے سے متعارف ہوتا ہے۔ بلکہ اس کتاب کے حوالے سے جمال النساء کی بے باک ونڈر اور اولوالعزم شخصیت اور ان کے عہد کا تجزیہ کیا جائے تو کئی ایک حیران کن پہلوؤں کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ جمال النساء کی ابتدائی زندگی کے برس ایک ایسے دور پر محیط ہیں جہاں لڑکی کی تعلیم یا عملی زندگی میں اس کی حصہ داری کا رجحان سماج میں پوری طرح پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ اس دور میں لڑکیوں کو ان کی شخصیت کی مکمل نشوونما یا اظہار خیال کے لیے بھرپور مواقع دیے جاتے تھے۔ بلکہ عورت کے وجود کو صرف گھریلو معاملات کی ذمہ دار و افزائشِ نسل کا کام انجام دینے والی ایک فرد تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے دور میں جمال النساء نے ابتدا ہی سے اپنی منفرد سوچ و فکر کی حامل شخصیت کو اس دور کے تقاضوں اور سماجی نظریات کے برخلاف ڈھالا۔ اپنے لیے موافق حالات بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اپنی عملی زندگی کے لیے ایک جداگانہ راہ تلاش کی جس کے نتیجے میں انھیں مواقع ملتے رہے اور انھوں نے بڑی بہادری سے ان راہوں پر چلتے ہوئے نہ صرف ایک انقلابی مجاہد آزادی بن کر ملک کی آزادی میں سرگرم رول نبھایا بلکہ سیاسی و سماجی جہدکار کی حیثیت سے دیگر تحریکات اور خواتین کی ترقی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرڈالی۔

جمال النساء کا یہ کارنامہ بھی ناقابلِ فراموش قرار دیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر ''بکھری یادوں'' کو کتابی شکل میں پوری سچائیوں کے ساتھ محفوظ کردیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے بدلتے سماجی و سیاسی حالات، تغیر پذیر تہذیب، قدیم و جدید فکر کے حامل افراد کا آپسی ٹکراؤ نیز مختلف سیاسی و سماجی اور ادبی تحریکات اور ان سے وابستہ سینکڑوں افراد کے احوال و عادات کے ساتھ ساتھ جمال النساء کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلو اپنی پوری حقیقت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر اس یادداشت کو ایک جامع معاشرتی تاریخ کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے جہاں ہمیں تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ کئی ایک پوشیدہ حقائق کو جاننے کا موقع فراہم ہوتا ہے وہیں ایک باحوصلہ اور اولوالعزم خاتون کی شخصیت سے بھی تعارف حاصل ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ عمر رضا ''اردو میں سوانحی ادب۔ فن اور روایت، 2013، ص 18

2۔ بحوالہ ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء۔ از ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، ص 7

3۔ پروفیسر وہاج الدین علوی ''اردو خودنوشت۔ فن اور تجزیہ، 1989، ص 417۔

4۔ ابتدائیہ ''بری عورت کی کتھا''۔ بحوالہ ''اردو کے شہرہ آفاق خودنوشت۔ ایک تجزیاتی مطالعہ'' از ڈاکٹر ایس مظفرالدین، 2005، ص 21

5۔ خودنوشت۔ بیتی کہانی۔ از شہر بانو بیگم (دختر نواب اکبر علی خاں رئیس پاٹودی) مرتب معین الدین عقیل، 1985، ص 8

6۔ جمال النساء ''اس تحریر کے بارے میں'' مشمولہ ''بکھری یادیں''، ص 9

7۔ جمال النساء ''بکھری یادیں''، ص 92

8۔ ایضاً ص 27، 28

9۔ ایضاً ص 53

10۔ ایضاً ص 45، 46

□□□

Amena Tahseen
Dept. of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 (Telangana)

شیخ شوکت ندوی

پریم لتا اگروال

ماؤنٹ ایوریسٹ پر پہنچنے والی ہندوستانی خاتون

پریم لتا اگروال پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے 50 سال کی عمر میں ہمالہ پر چڑھنے کا ریکارڈ اپنے نام درج کرایا۔ 2011 میں پریم لتا کو ماؤنٹ ایوریسٹ کی بلندی تک پہنچنے والی سب سے زیادہ عمر کی خاتون ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

پریم لتا کی پیدائش ایک تاجر پیشہ گھرانے میں ہوئی۔ وہ راما اوتار اگروال کی بیٹی ہیں۔ ان کی پیدائش 1963 میں ویسٹ بنگال کے ضلع دارجلنگ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سوکھیا پوکھری میں ہوئی۔ پریم لتا اپنے والدین کی 9 اولادوں میں سے ایک ہیں۔ وہ ہائر سیکنڈری اسکول تک بھی نہیں پہنچ پائی تھیں جب ان کی شادی صحافی ویمل اگروال سے 18 سال کی عمر میں ہوگئی۔ اس وقت وہ دو بچوں کی ماں ہیں۔ ایک مرتبہ جب پریم لتا بیٹیوں کو ان کی ٹینس کی ٹریننگ کے لیے جمشید پور کے جی آر ڈی ٹاٹا اسپورٹس کامپلیکس لے کر گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ ڈالما ہل ٹریک (جمشید پور مضافات کی ایک چھوٹی سی پہاڑی) پر چڑھنے کا ایک مقابلہ ہے جو ٹاٹا اسٹیل اڈونچر فاؤنڈیشن نے منعقد کیا تھا۔ اس میں پریم لتا اگروال نے شرکت کی۔

2008 میں 35 سال کی عمر میں پریم لتا اگروال ساؤتھ افریقہ کے ماؤنٹ کیلمانی پر بچھندری پال کی نگرانی میں چڑھیں، ان کی محنت اور جفاکشی سے متاثر ہوکر بچھندری پال نے کہا ’پریم! میرا خیال ہے تمھیں ماؤنٹ ایوریسٹ کے لیے بھی کوشش کرنی چاہیے تمھارے اندر وہ قابلیت اور صلاحیت ہے۔‘ جب انھوں نے اپنے شوہر سے اس کی اجازت طلب کی تو ان کے شوہر نے حوصلہ افزائی کے کلمات کے ساتھ اجازت دے دی اور کہا کہ جب بچھندری پال کا ایسا خیال ہے تو آپ کو میری جانب سے آگے بڑھنے کی اجازت ہے۔

48 سال کی عمر میں اپنے استاد کے نظریہ کے مطابق عمر تو محض ایک عدد ہے، پریم لتا نے دنیا کی سب سے اونچی و بلند چوٹی پر چڑھنے کی تیاری شروع کردی۔ اس راہ میں انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹخنے کا مسلسل درد بطور چیلنج بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ غذائی ترجیحات اور موسمی تبدیلیوں کا سامنا کرنا ایک بہت ہی سنگین مرحلہ تھا۔ پریم لتا اگروال کہتی ہیں کہ ایک ہی مقصد تھا جس کے لیے وہ کام کررہی تھیں ملک کے قومی پرچم کو ایوریسٹ کی بلندی پر لہرانا۔ بالآخر 20 مئی کو 48 سالہ پریم لتا ہندوستان کی پہلی ماؤنٹینیر خاتون بن گئیں جنھوں نے دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ کی بالائی چوٹی پر ہندوستانی پرچم لہرایا۔

(انگریزی سے ترجمہ ’لائف 365‘، پونے)

Shaikh Shaukat Nadvi
Bushra Cottage
H. No. 8/ 12/ 458,Nagsen Colony, Khas
Gate, Jinsi, Aurangabad-431005, (MS)

شاعرات کے منتخب اشعار

وہ چھانٹتے رہے شاخ اور سایہ دار ہوئی
یہی تو بات بہت ان کو ناگوار ہوئی

جب زمینوں سے نئی کوئی تعلق ہی نہیں
کوئی پوچھے ہمیں ہجرت کی ضرورت کیا ہے

نسیم سید

گرتے گرتے تھام لیا ہے کئی صداؤں نے
میری ماں کی مدھم، نامحسوس دعاؤں نے

میں نے تو آواز پہ اس کی کان لگائے تھے
بند دریچہ کھول دیا ہے تیز ہواؤں نے

حمیرا رحمٰن

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو مری دانش مرے افکار میں دیکھیں

اس قادر مطلق نے بنایا ہے ہمیں بھی
تعمیر کی خوبی اسی معمار میں دیکھیں

فاطمہ حسن

شبنم نے فرطِ شوق میں موتی لٹائے ہیں
لبریز گل کے ہاتھ میں جامِ بہار ہے

میٹھا سا اک گیت ہے موجوں کے شور میں
دریا کے پار کس کو مرا انتظار ہے

مونا شہاب

فنا کے تیر ہوا کے پروں میں رکھے ہیں
کہ ہم گھروں کی جگہ مقبروں میں رکھے ہیں

ہمارے عہد کا انجام دیکھیے کیا ہو
ہم آئینے ہیں مگر پتھروں میں رکھے ہیں

نسرین نقاش

میں تیرے ہجر زدہ موسموں کی زد میں ہوں
پسِ خیال تری قربتوں کی حد میں ہوں

میں چاہتی ہوں اجالا مری زمیں پر ہو
میں اک دیا ہوں مگر روشنی کی مد میں ہوں

ذکیہ غزل

دل ڈھونڈھتا ہے اپنی ہی آواز گم شدہ
ٹوٹے ہوئے پروں میں بھی پرواز گم شدہ

میرا وجود اور وہ اک دشت ماورا
ٹھرا گئی ہوں پا کے کئی راز گمشدہ

عذرا پروین

بارش کا امکان بھی کیسا، دھوپ چمکتی رہتی ہے
دل کے اندر کا موسم کب آنکھوں تک آ پایا تھا

اپنے گھر کی چھاؤں سمجھ کر جس کے سائے بیٹھ گئی
وہ تو یگلی، اک آوارہ بادل کا ہی سایہ تھا

عظمیٰ صبوحی سحر

عذرا نقوی

وہ منزل ابھی نہیں آئی

ہر سال ہم آٹھ مارچ کو یوم خواتین مناتے ہیں۔ کچھ تقریریں ہوتی ہیں، سیمنار ہوتے ہیں، ادبی رسائل کے خواتین نمبر نکالے جاتے ہیں۔ خواتین کے مشاعرے ہوتے ہیں، فیس بک پر پیغامات بھیجے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقوق نسواں کے حوالے سے، پیہم کوششوں کے باوجود بہت سے سوالیہ نشان اب بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جن کی گونج ہمیں پارلیمنٹ، اخباروں، سیمناروں، احتجاجی مظاہروں میں سنائی دیتی ہے اور ان سوالوں کا جواب عورتیں اپنے گھروں اور گھروں سے باہر، صبح سے شام تک ڈھونڈتی رہتی ہیں اور کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی گھسیٹتی رہتی ہیں۔ یوں دیکھیں تو یہ مسئلہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ عورتیں کیا چاہتی ہیں؟ صرف انسان کی طرح جینے کا حق چاہتی ہیں۔

انسان کی طرح جینے کا حق، کیا ہے۔ 1948 میں اقوام متحدہ نے ساری دنیا کے لیے جو تیس نکات، چارٹر ان ہیومن رائٹس میں درج کیے تھے، ان میں سب سے پہلا ہے۔ ہر فرد آزاد پیدا ہوا ہے اور سب کی عزت اور حقوق برابر ہیں۔ لیکن اب ذرا غور کریں کہ کیا آج بھی آزادی اور برابری کے بنیادی انسانی حق کا اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے؟

پلٹ کر دیکھتے ہیں تو عورتوں کی سماجی حیثیت اور حقوق کی ایک لمبی داستان نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد دلاتی چلوں کہ اقوام متحدہ نے پوری ایک دہائی یعنی 1975 سے 1985 تک عورتوں کے حقوق کے نام منسوب کی تھی۔ جس کے نتیجے میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں کم از کم دنیا بھر میں ایک بیداری تو پیدا ہوئی ہے۔ نہرو جی نے کہا تھا کہ کسی ملک کی حالت کا اندازہ اس ملک کی عورتوں کے اسٹیٹس کو دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں عورتوں کے حقوق کی بازیابی ایک لمبا سفر ہے اور اب بھی یہ سفر کسی حد تک کامیابی سے جاری ہے، لیکن بہت سے مراحل ابھی طے کرنے باقی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر اگر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی کہ ہندوستان میں عورتوں کے حقوق کی لڑائی مردوں نے ہی چھیڑی تھی اور اس وقت کی انگریزی سرکار کی مدد سے پہلے ان روایات کو ختم کیا جو عورت کے استحصال کی ذمہ دار تھیں۔ جیسے ستی کی رسم، بال وواہ وغیرہ۔ راجہ رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر، علی گڑھ کے شیخ عبداللہ، جنھوں نے حقوق نسواں کے لیے آواز اٹھائی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ اس کے بعد عورتوں کی تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں تیز تر ہوئیں کیونکہ تعلیم کے بغیر عورتیں اپنا حق لینا تو درکنار، حق پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ گاندھی جی نے آزادی کی جدوجہد میں عورتوں کو بھی شامل کیا، اس زمانے کی تعلیم یافتہ عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ سارے ملک میں عورتوں کی بہت سی تنظیمیں تھیں جو عورتوں کی تعلیم اور ان کو بااختیار بنانے کے لیے، اپنے دائرۂ عمل میں کوشاں تھیں۔ اس دور کی کچھ تاریخ ساز خواتین کے نام ہمیں بھولنے نہیں چاہیے۔ جیسے بنگال کی سرلا رائے کامنی گانگولی اور رقیہ سخاوت حسین، بھوپال کی سلطان جہاں بیگم، جنوبی ہند کی للت امبیکا انتھرجنم، علی گڑھ کی بیگم عبداللہ اور برارا کی تارابائی شندے۔

آزادی کے بعد اس جدوجہد کو ایک سمت مل گئی، ہمارے آئین میں خواتین کو برابری کا درجہ دیا گیا۔ اب عورتیں سیاست میں اپنی حصہ داری اور روزگار میں برابر کے مواقع اور کام کی جگہ پر بہتر برتاؤ کا اصرار کرنے لگیں۔ ہمارے ملک کے آئین میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیا گیا ہے، ووٹ کا حق ہے، قانونی تحفظ کی یقین دہانی ہے۔ ملازمتوں میں عورت کو مرد کے برابر تنخواہ ملتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ آج ہندوستان میں ایک طبقے کی عورتوں کو سیاسی اور کاروباری دنیا میں کافی مواقع حاصل ہیں۔ ہر شعبہ زندگی میں اہم عہدوں پر ہمیں عورتوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ الیکشن میں عورتوں کے لیے کچھ نشستیں مخصوص ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے پہلے ہمارے ہی ملک میں خاتون وزیراعظم ہوئیں۔ حال ہی میں ہمارے ہمارے ملک کی صدر بھی ایک خاتون ہی تھیں۔ ہر ریاست میں ایک دو خواتین منسٹر بھی ہوتی ہی ہیں۔ صوبائی ریاستوں میں خواتین وزیراعلیٰ بھی رہی ہیں۔

آج کی ہندوستانی عورتوں کا ایک طبقہ احتجاج پر آمادہ ہے، اپنا حق مانگنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ خود اپنی محنت سے اور ہمت سے اپنے حقوق حاصل کر رہا ہے۔ حکومت ان کی فلاح و بہبود کے لیے اسکیمیں بنا رہی ہیں جن کا ٹی وی اور ریڈیو پر اشتہار بھی آتا رہتا ہے۔ کل ہی میں نے ریڈیو پر بیٹی کو بھی خاندانی وصیت میں شامل کرنے کا ایک سرکاری پیغام سنا، بہت اچھا لگا۔ عائلی قوانین کو لے کر بھی میڈیا میں بہت کچھ ہنگامے حال ہی میں ہم سب نے دیکھے۔ دنگل جیسی فلم کا چرچا ہوا جس میں بالکل غیر روایتی انداز میں لڑکیوں کو کشتی چیمپئن بنتے دکھایا گیا تھا۔ بہ ظاہر صورت حال اطمینان بخش لگتی ہے۔ میڈیا کے سیکڑوں ٹی وی چینلز پر خاتون اینکرس نظر آتی ہیں اور اخباروں میں کالم بھی لکھتی ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ آج بھی سماج میں عورت کو عورت ہونے کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ لیکن صرف قانون بنا دینے سے، اسکیمیں نافذ کرنے سے کام نہیں چلتا۔ مرد اساس معاشرے کے ہر طبقے میں عورت کو اب بھی مرد سے کم تر اور اس کے ماتحت سمجھا جاتا ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی بے جا سماجی روایات کی وجہ سے عورت کے حقوق کی پامالی اب بھی ہوتی ہے۔ یہ صرف گاؤں یا پچھڑے ہوئے علاقوں کی بات نہیں شہروں کی خواتین بھی اس کی زد میں ہیں۔ ایک نظر کچھ مسائل پر ڈالتے چلیں جو آپ سب کے جانے پہچانے ہیں، لیکن ہم سب کسی نہ کسی طرح اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔

کیا جہیز دینے کی رسم کے خلاف قانون بننے سے یہ لعنت سماج سے ختم ہو گئی؟ جی نہیں۔ بلکہ آج کے صارفی سماج نے اسے اور بڑھاوا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ جہیز لینے اور دینے کا چلن ہمارے یہاں بہت بڑھ گیا ہے۔ جہیز کی وجہ سے ہی لڑکیوں کو ایک ذمہ داری یا بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کا پیدا ہونا ایک بوجھ کی طرح اب بھی دیکھا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے جنین کشی کا گناہ لوگ بغیر کسی احساس جرم کے کرتے ہیں۔ بلکہ یہ تو ڈاکٹروں کے لیے ایک بہت منافع بخش کاروبار بن گیا ہے حالانکہ پیدا ہونے والے بچے کی جنس معلوم کرنے کے ٹسٹ کو 1994 میں جرم قرار دینے کا قانون بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد، عورت اور مرد کی آبادی کے تناسب کے جو اعداد و شمار مختلف صوبوں سے ملتے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ قانون بننے سے کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ جب عورت ذمہ داری سمجھی جائے گی تو ظاہر ہے، اس کی غذا اور تعلیم پر کم توجہ دی جائے گی۔ سرکاری اعداد و شمار بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

عورتوں کو بااختیار بنانے کا ذکر میڈیا میں بہت ہوتا ہے۔ کتنی بااختیار ہے ہماری ہندوستانی عورت؟ اس کو اپنے جسم اور افزائش نسل پر کتنا اختیار ہے۔ پڑھی لکھی عورت گھر کی مالی معاونت کے لیے گھر سے باہر کام کرتی ہے۔ لیکن اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اسے اپنی کمائی پر بھی پورا اختیار نہیں ہوتا۔ گھر سے باہر ملازمت کرنے کے باوجود، گھر کا سارا کام اور انتظام صرف عورت کے ذمہ رہتا ہے یعنی دوہری ذمہ داری۔ آج کل لوگ کماؤ بہویں بھی چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ امور خانہ داری میں بھی وہ طاق ہوں اور عورتیں خود بھی اپنے آپ کو سُپر وومن ثابت کرنے میں جان لگا دیتی ہیں۔

گاؤں کے کھیتوں میں عورت مرد کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہے لیکن کیا گھر اور برادری کے معاملات اور فیصلوں میں اس کی حصہ داری ہے۔ ہر چند کہ آج کل کچھ نسوانی نام گاؤں کے سرپنچ کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ لیکن اکثر لمبے گھونگھٹ منہ پر ڈالے یہ خواتین اپنے گھرانے کے مردوں کے اشاروں پر ہی چلتی ہیں اور یہ بھی کمال ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو محکوم بنا کر رکھا جاتا ہے لیکن جب بات خاندان کی عزت کی ہوتی ہے تو اس کی ذمہ دار وہی ٹھہرتی ہے۔ آنر کلنگ کی خبریں اب بھی عام ہیں۔ اس کے لیے صرف ایک شعر کہوں گی:

روایت کا گلے میں طوق سر پر تاج کانٹوں کے
ہمیں پر منحصر کر دی گئی عزت گھرانے کی

میڈیا میں جنسی استحصال کو لے کر بہت سی خبریں ہم تک پہنچتی ہیں۔ یہ تو صرف چند واقعات ہوتے ہیں جو خبر بن جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں اور عورتیں، خاندان کی عزت کا پاس رکھنے کے لیے، جنسی

استحصال کو خاموشی سے سہہ جاتی ہیں۔ ان کے گھر والے بھی اس کے خلاف نہ شکایت کرتے ہیں نہ آواز اٹھاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ''می ٹو'' کا بہت چرچا رہا۔ خواتین نے ماضی میں ہوئے اپنے جنسی استحصال کی کہانیاں عام کیں، بہت سے مشہور لوگوں کے نام سامنے آئے، اس پر کافی اختلاف رائے بھی نظر آیا کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وقت کیوں نہیں آواز اٹھائی جب ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ جتنا عورتوں کے ساتھ استحصال ہوا ہے اس کا عشر عشیر بھی سامنے نہیں آیا۔ دیر ہی سے سہی لیکن خواتین نے ہمت تو کی کہ سچ سامنے لائیں۔ کتنی خواتین اب بھی خاموش بیٹھی ہیں، اندر ہی اندر خود سے الجھتی رہتی ہیں۔

ہزار مثالیں عورت کے حقوق کی پامالی کی ہمارے گرد وپیش میں ہیں جو کسی قانون سے نہیں بلکہ صرف ذہنیت بدلنے سے ہی مٹائی جا سکتی ہیں۔ ایک بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ عورتوں میں تعلیم اور معاشی خود مختاری اس راہ میں ہمیں ایک ایسے معاشرے کی طرف لے جا سکتی ہے جہاں عورت کے لیے ترقی کی نئی راہیں ہموار ہوں۔ جب وہ کسی کی دست نگر نہیں ہوگی تو با اختیار ہونے کی راہیں کھل جائیں گی۔ دوسری بات یہ کہ ہم اپنی پڑھی لکھی، ملازمت پیشہ لڑکیوں کو بھی ایک آئیڈیل بہو بنانے کے لیے ہر طرح کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے بیٹوں کی پرورش بھی اسی طرح کرنی چاہیے کہ وہ برسوں سے چلی آرہی مردوں کی بالادستی کی روایت کی دھند سے نکلیں اور عورت کو ایک انسان کی طرح دیکھیں اور سمجھیں۔ آج خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ بہنو! چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔

□□□

Azra Naqvi
Unitech Horizon, Tower 11, Flat 502
Greater Noida- Sector Pi-2
G. B. Nagar-201308 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

نسرین بیگم (علیگ)

عورتوں کے مسائل اور ہمارا معاشرہ

اردو شاعری میں عورت زلف و رخسار، ناز و ادا، قد و قامت، دست حنائی، نازکی اور نرمی سے عبارت ہے۔ مثنوی سحرالبیان میں بدر منیر جس طرح گھٹ گھٹ کر ہجر کی کیفیت بیان کرتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورت کی سماجی حالت کیا تھی اور معاشرے میں اس کا کیا مقام تھا۔ آگے چل کر 1857 کے انقلاب نے کافی تبدیلی پیدا کی۔ عورت کی آزادی سے متعلق مسائل کی طرف بھی لوگوں نے غور کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے عورت کی خوبیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا:

اے ماؤ بہنو بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
مونس ہو خاوندوں کی تم، غم خوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب، گھر بھر کی برکت تم سے ہے

اختر شیرانی اور عظمت اللہ خاں نے عورت کو اپنی شاعری میں مرکزی حیثیت دی ہے۔ عورت کو عذرا اور سلمیٰ کہہ کر مخاطب کیا۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو نیا ادب لکھا جانے لگا اور اردو شاعری کی نئی، زندہ اور توانا تاریخ مرتب کرنے والے شاعروں میں اسرار الحق مجاز روحانی اور انقلابی آہنگ لے کر سامنے آئے۔ ترقی پسند تحریک کا یہ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے عورت کی اپنی شناخت اور اس کے حقوق کی بات کرتا ہے، عورت کو اپنے ہر مسائل اور حالات میں ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے اور عورت کو ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بھی اپنے ساتھ کھڑا پاتا ہے۔ نظم 'نوجوان خاتون سے' مخاطب ہو کر مجاز نے کہا تھا:

"تاریخ گواہ ہے کہ رضیہ سلطان کو التمش نے اپنا ولی عہد اور جانشیں مقرر کیا تھا۔ وہ ہندوستانی تاریخ کی اولین خاتون تاجدار تھیں۔ بیگم حضرت محل آزادی کے جس مقصد کو لے کر چلیں تھیں اسے ہر لمحہ پیش نظر رکھا۔ مولانا حسرت موہانی کی بیوی نشاط النسا۔ بیگم ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں حسرت موہانی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی بیوی زلیخا بیگم ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آزاد کے بار بار جیل جانے کو خوشی سے برداشت کرتی رہیں۔ چاند بی بی، مہارانی لکشمی بائی، عزیزن بائی، صغرا بی بی، بھگوان دیوی، جھلکاری بائی، اونتی بائی، اودا بائی، بیگم حضرت محل جیسی خواتین کا نام تاریخ میں روشن باب ہے جس کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے"

ستائیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

مجاز نے ضمیر کی سچائیوں اور حالات کی ستم ظریفیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ عورت کو برابری کا درجہ دینے کی بات کرتے ہیں۔ عورت کے بغیر گھر ویران ہے، خاوند کی وہ مونس ہے اور دنیا کی زینت اسی کے دم سے ہے۔ اپنے فرزندوں کی وہ غم خوار ہے گھر کی برکت بھی اسی سے ہے۔' مجھے حیران کر دیتی ہے نکتہ دانیاں اس کی' ان باتوں سے دنیا کا کوئی بھی شخص آج تک انکار نہیں کر سکا۔ پھر اکیسویں صدی میں سب سے زیادہ مسائل کے بیچ میں رہ کر عورت زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہے؟ ہمارے معاشرے کے سامنے یہ بہت بڑا سوال ہے اور ہر سوال جواب چاہتا ہے۔ اس کا جواب ہمیں خود ہی تلاش کرنا ہوگا۔

تاریخ گواہ ہے کہ رضیہ سلطان کو التمش نے اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا تھا۔ وہ ہندوستانی تاریخ کی اولین خاتون تاجدار تھیں۔ بیگم حضرت محل آزادی کے جس مقصد کو لے کر چلیں تھیں اسے ہر لمحہ پیش نظر رکھا۔ مولانا حسرت موہانی کی بیوی نشاط النساء بیگم ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں حسرت موہانی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بیوی زلیخا بیگم ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آزاد کے بار بار جیل جانے کو خوشی سے برداشت کرتی رہیں۔ چاند بی بی، مہارانی لکشمی بائی، عزیزن بائی، صغرا بی بی، بھگوان دیوی، جھلکاری بائی، اونتی بائی، اودا بائی، بیگم حضرت محل جیسی خواتین کا نام تاریخ میں روشن باب ہے جس کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ تحریک آزادی سے آج تک خواتین نے ہر میدان میں ترقی کی ہے۔ 2018 میں بین الاقوامی یوم خواتین کے پورے ایک سو آٹھ سال (1910-2018) مکمل ہو چکے ہیں بلکہ یوں کہیں کہ خواتین کے حقوق کی لڑائی پورے ایک سو آٹھ سال سے لڑی جا رہی ہے مگر ہم اس لڑائی میں کہاں تک کامیاب ہوئے آج ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ عورتوں کو جو اختیارات دیے گئے ہیں ان میں قانونی برابری، جنسی بنیاد پر غیر امتیازی سلوک، ملازمت میں برابری اور برابر اجرت، کام کے لیے بہتر حالات مہیا کرانا، پنچایتوں اور میونسپلٹیوں میں ریزرویشن کے لیے عورتوں کو اختیارات دیا جانا شامل ہے۔ عورتوں کے لیے آمدنی والی اسکیمیں اور گرانٹس بھی کم ہیں اور عورتوں کے ساتھ تشدد کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ چاہے وہ قومی ایشیائی کمیشن ہو یا پھر نیشنل کمیشن فار وومن جو عدالتوں کے لیے پالیسی بناتا ہے لیکن زمینی سچائی تو یہ ہے کہ کتنی بھی سفارشات اور ریزرویشن ہو جائے عورت کی حالت آج بھی نہیں بدلی ہے۔

پوری دنیا میں صرف 10 فیصدی حصہ انھیں ملتا ہے۔ UNO کی رپورٹ کے مطابق وہ، 10 فیصد جائیداد کی مالک ہے۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کے معاملے میں یونائیٹڈ نیشن نے ہندوستان کو 108 ویں نمبر پر رکھا ہے۔ آج بھی ہندوستان میں عورتوں کو دوئم درجے کا شہری مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں خواتین کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پیٹ پالنے کے لیے مختلف قسم کے خطرناک کارخانوں میں کام کرتی ہیں اور بچے کی پیدائش کے وقت اپنی جان گنوا دیتی ہیں۔ نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو (N.C.R.B) کے مطابق 1998 میں انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 439-A شادی شدہ عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کے تحت عدالتوں میں قریب 127,691 معاملے درج ہیں۔ ان میں صرف 13.2 کی سنوائی ہو سکی ہے۔ جبکہ صرف 2.6 فیصدی معاملوں کی سنوائی پوری ہو کر مجرموں کو سزا مل پائی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو 84 فیصد معاملے اب بھی عدالت میں چل رہے ہیں۔ سنٹر فار وومن ڈیولپمنٹ کی رپورٹ کے مطابق جہیز کی وجہ سے روزانہ 12 اور اس سے زیادہ عورتیں موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ جبکہ 40 فیصد عورتیں اپنے شوہر اور سسرال والوں کے ذریعے جسمانی تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ 50 فیصد عورتوں کو اس وقت مارا پیٹا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہوتی ہیں۔ گھریلو جھگڑوں میں خواتین کی موت زیادہ ہوتی ہے۔ ان معاملوں میں رپورٹ بھی نہیں کی جاتی۔ 498-A کے تحت درج معاملے میں قریب 40 فیصد عورتیں خودکشی، حادثہ یا قتل کے سبب اپنی جان تک گنوا دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں قانون کا سہارا ابھی لیتی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ زنا بالجبر کی شکار عورتیں معاشرے کی بدنامی کی وجہ سے خودکشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ایسی عورتیں دوہری مار کا شکار ہوتی ہیں۔

دوسرا بنیادی اور اہم سوال یہ ہے کہ اتر پردیش تعلیم کے میدان میں بہت پس ماندہ ہے۔ عورتوں کی تعلیم پر توجہ کم ہے۔ کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے بچوں کی اموات، خاندانی منصوبہ بندی کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اتر پردیش میں پانچ کروڑ میں سے تین کروڑ بچے ہی اسکول جاتے ہیں۔ یہاں کے 1,24,000 گاؤں جس میں سے تقریباً 40 ہزار گاؤں میں کوئی پرائمری اسکول نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم 41.6 فیصد ہے جو اوسط سے 17 سال پیچھے ہے۔ سرکاری شرح کے مطابق عورتوں کی تعلیم کا فیصد 45-52 ہے جبکہ اصلیت میں 40 فیصد سے بھی کم ہے۔ دیہی علاقوں میں عورتوں کی تعلیم کا فیصد 19.2 ہے۔ اتر پردیش میں 55 فیصد لڑکیوں کے مقابلے 27 فیصد لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کی

تعلیم کے لیے نواب سلطان جہاں بیگم نے کہا تھا:

’تعلیم میرے نزدیک ایک عورت کا سب سے اچھا زیور ہے۔ ہم نے شاید یہ بات بھلادی ہے کہ عورتیں بھی ملت کا نصف ہیں اور حقیقی ترقی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت کے اس اہم شعبے کی تعلیمی ضروریات ہماری غفلت شعاری کا شکار رہیں گی‘۔2

خواتین ہمارے معاشرے کا وہ حصہ ہیں جس کے بغیر کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ ناخواندہ ہونے کی وجہ سے عورتیں زیادہ تر مزدوری کرتی ہیں اور انھیں اجرت بھی کم دی جاتی ہے۔ بنائی کے کام میں عورتیں 12-10 گھنٹے تک جھک کر کام کرتی ہیں جس کی وجہ سے وہ کمر کے درد کا شکار ہیں۔ آگرہ کی بنکر عورتوں کی حالت کافی خراب ہے۔ فتح پور سیکری، وگینئر، فتح آباد میں غالیچے بنانے کا کام کرتی ہیں۔ مگر ان کی اجرت بہت کم ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنا بے حد ضروری ہے۔ ان تمام مسائل کو لے کر جب تک عورتیں بیدار نہیں ہوں گی تب تک کتنے بھی قانون بن جائیں کچھ بھی نہیں ہونے والا ہے۔ عورتوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے:

یہ تیرا زرد رخ یہ خشک لب یہ وہم یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

آج عورت اپنے گھر اور سسرال میں طرح طرح کے مظالم سہتی ہے۔ مار پیٹ، کسی بھی طرح کی جسمانی چوٹ پہنچانا، بے عزت کرنا، نوکری کرنے سے روکنا اپنی تنخواہ کا استعمال نہ کرنے دینا وغیرہ ان تمام بڑھتے ہوئے جرائم کو روکنے کے لیے 26 اکتوبر 2006 میں گھریلو تشدد سے خواتین کی حفاظت کے لیے حکومت کی جانب سے اس سمت قدم اٹھایا گیا مگر گھریلو تشدد مخالف قانون کتنا کارآمد کتنا با اثر ہے یہ جواب آج بارہ (12) سال گزرنے کے بعد دینا بے حد مشکل ہے۔ گھریلو تشدد میں بجائے کمی کے اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جہیز لینے اور دینے کا رواج عام ہے۔ یہ کسی ناسور سے کم نہیں ہے۔ جہیز کے لین دین سے متعلق قانون ممانعت جہیز ایکٹ 1961 ہے۔ جہیز سماج میں ایک بڑا جرم ہے اور یہ جرم بہت تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس جرم کو روکنے کے لیے اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا اور اپنی بیٹی کے ساتھ یکسانیت کا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ گاندھی جی نے کہا تھا:

’مرد عورتوں کو اپنا غلام یا کنیز سمجھنے کے بجائے دوست، ساتھی اور ہمدرد سمجھیں اور ان کو برابر کے حقوق دیں تاکہ ان کی ذہنی اور دماغی قوتیں پوری طرح سے اجاگر ہو سکیں اور وہ بھی مردوں کے ساتھ ملک کی ترقی کی جدوجہد میں برابر شریک ہو سکیں‘۔4

آج ہمارے معاشرے میں ایک خطرناک جرم ایسڈ اٹیک یا تیزاب سے جڑے حملے ہیں۔ ان کی وجہ ملزم کا چھوٹ جانا، تیزاب کے فروخت پر سخت قانون نہ ہونا ہے اور یہ بے حد افسوسناک ہے۔ (Section 326 A IPC) اس خطرناک اور دل دہلا دینے والے جرائم کے علاوہ ہمارے ملک میں بیوہ عورتیں بے سہارا ہیں اور اکیلی رہنے

پر مجبور ہیں۔ ان کی حالت بہت افسوسناک ہے اور بے سہارا عورتوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ شہری اور دیہاتی دونوں علاقوں میں یہ حالت ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جن کے شوہروں نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ یہ عورتیں یا تو بھیک مانگتی ہیں یا ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نئے سماجی قوانین سے بہت سی عورتیں اب بھی ناواقف ہیں۔ ان کی اس حالت کو بدلنے کی ذمہ داری، ریاست اور سماج کی ہے۔ عورتوں میں اپنے قانونی حقوق کا زیادہ سے زیادہ شعور پیدا ہو اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ 2001 کے اعداد وشمار کے مطابق 9 فیصد عورتیں بیوہ ہیں اور موجودہ دور میں ہندوستان میں بیوہ عورتوں کی تعداد تین کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ اس ضمن میں بھی ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ بیوہ عورتوں کے ساتھ عصمت دری اور جسم فروشی جیسے واقعات سامنے آتے ہیں:

> اس طرح سیوا داسی، پرتھا کا عام رواج ہے۔ ان بے سہارا عورتوں کے لیے کچھ راجیوں میں نام کے لیے بیوہ اور بے سہارا پینشن کا منصوبہ بنایا ہے۔ مگر اس کا فائدہ انھیں نہیں ملتا۔ اس پر سرکار کو توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔'5

مگر بات یہیں نہیں رکتی خواتین کے جنسی اور دوسرے جرائم بھی بہت تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں۔

نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو 2014 (NCRB) کے اعداد وشمار کچھ اس طرح ہیں جو چونکا دینے والے ہیں:

عورتوں کے خلاف کل تشدد	اتر پردیش 38467	قومی 3,37,922
عصمت دری	اتر پردیش 3,476	قومی 36,735
تشدد کی شکار عورت ملزم کو پہنچانتی تھی	1,111 معاملوں میں	
کسٹوڈین عصمت دری محافظ، نگراں، رکھوالا، Custodicin پولیس تھانہ، ہسپتال قانونی حراست	189 اتر دیش میں سب سے زیادہ	

عصمت دری کی کوشش	324	4,234
اغوا جنسی تشدد	10,623 8,605	37,111 82,235
جہیز کے لیے قتل	2,469 اتر پردیش میں سب سے زیادہ کل جرائم کا 29.2 فیصد	
چھیڑ خانی	4,435	21,978

اس رپورٹ سے یہ بات سمجھ میں آجانی چاہیے کہ جہیز ایکٹ ہو یا دوسرے قانون اپنے مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام ہیں۔ جنسی تشدد، معاشی تشدد، زبانی اور جذباتی تشدد، خودکشی کی دھمکی دینا، تیزابی حملے کا تیزی سے بڑھنا ہمارے معاشرے کے لیے بے حد تشویش ناک بات ہے۔ گھریلو تشدد مخالف قانون کے ساتھ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ خواتین کے تئیں اس نظریہ کو سماجی منظوری دلائی جائے کہ خواتین بھی مردوں کی طرح ہی انسانی حقوق اور اعزاز حاصل کرنے کی حقدار ہیں۔ انھیں یہ حق ملنا ہی چاہیے۔ خواتین کے حق کی آواز بلند کرنے والی ڈاکٹر رشید جہاں جنھوں نے خواتین کے مسائل کو اپنے قلم کا موضوع بنایا اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ 1931 میں سجاد ظہیر کی ادارت میں 'انگارے' کی اشاعت ہوئی تو اس میں رشید جہاں کا افسانہ 'پردے کے پیچھے' اور 'دلی کی سیر' شائع ہوا۔ پھر کیا تھا رشید جہاں کے خلاف احتجاج شروع ہوگیا اور اس کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ اسی انگارے والی کے بارے میں مشہور سماجی کارکن سہاشنی علی نے کہا تھا:

> 'انگارے والی کے خلاف فتویٰ دینے والوں کی نفسیات والے لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ ان کی یاد میں کسی طرح کا پروگرام کرنا تو بہت ہی خطرناک ثابت ہوجائے گا۔ لوگوں کے ہاتھ پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہمت رکھنے والی عورتیں و مردوں نے کامیاب پروگرام کیا۔ دنیا بھر سے لوگ آئے اس سے ہمیں یہ حوصلہ ملتا ہے کہ جس لڑائی کا رشید جہاں اور ان کے ساتھیوں نے آغاز کیا تھا اسے بہت آگے لے جانا باقی ہے۔' 7

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ عورتوں کے مسائل کے بارے میں کتنا حساس ہے اور آج جب ہم حقوقِ نسواں کی بات کرتے ہیں

"خواتین کے اس سال کا تھیم تھا 'تبدیلی کے لیے بہادر بنیں' 'Be bold for change'۔ اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے سامنے مسائل ہی مسائل ہیں اور ان میں بیشتر مسائل خواتین کے ہیں۔ آج عورتوں کو جائز مقام حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت مرحلے طے کرنے باقی ہیں"

تو عورتوں کے مسائل میں ہمیں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔ جبکہ دنیا بھر میں خواتین کے حقوق کی بحالی کی لوگ بات کرتے ہیں۔ لوگ یہ بھی جاننے لگے ہیں کہ ملک اس وقت تک ترقی کے منازل طے نہیں کرسکتا ہے جب تک اس کی نصف آبادی تعلیم، کام اور فیصلہ سازی کے حق سے محروم ہے۔ عصمت دری کے واقعات بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ نیشنل کرائم ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں میزورم اور سکم تیسرے نمبر پر ہیں، جہاں خواتین سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ اس کے بعد مدھیہ پردیش کا نمبر آتا ہے۔

دسمبر 2012 میں دہلی میں ایک لڑکی کے ساتھ عصمت دری اور اس کی موت کے نتیجے نے پورے ملک کو ہلادیا اور یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ کیا ہمیں خواتین کی آزادی اور تحفظ کو سنجیدگی سے لینا چاہیے؟ اس کے بعد ملک میں سخت قوانین بنائے گئے ہیں۔ لیکن عمومی رائے کے مطابق یہ قوانین واقعات روکنے میں ناکام رہے۔ ہندوستان میں تازہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2015 کے مقابلے میں گزشتہ برس جرائم کی تعداد میں 2.6 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ جرائم کے سب سے زیادہ واقعات اتر پردیش میں رونما ہوئے۔ یہاں سب سے زیادہ 9.5 فیصد جرائم درج کیے گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا معاشرہ خواتین کے تحفظ اور احترام کو یقینی بنانا چاہتا ہے؟ اور ہم اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ 1914 میں ہی اینی بسنٹ نے ہندوستان کے لوگوں سے کہہ دیا تھا:

'اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں عورتوں کی حالت کی اصلاح کرنی چاہیے'۔8

ہمیں اس قول سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ 1914 میں جس بات کی طرف اینی بسنٹ نے اشارہ کیا تھا آج 2018 میں اس بات کی ضرورت اور اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ خواتین کے اس سال کا تھیم تھا 'تبدیلی کے لیے بہادر بنیں' 'Be bold for change'۔ اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے سامنے مسائل ہی مسائل ہیں اور ان میں بیشتر مسائل خواتین کے ہیں۔ آج عورتوں کو جائز مقام حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔ عورتیں اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں۔ مفلسی اور غریبی میں زندگی بسر کررہی ہیں۔ وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ انھیں ان کا کھویا ہوا وقار کیسے حاصل ہو۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

بقول ڈاکٹر سید مبین زہرا:

'صرف اعداد و شمار کی بات نہیں، یہ ایک ایسے سماج کی تصویر دکھارہی ہے جو اخلاقی طور پر گراوٹ کا شکار ہوچکا ہے اور اس کا گرنا اب بھی جاری ہے۔ کم آمدنی والے طبقات کی 64 فیصد خواتین اس کا شکار زیادہ دکھائی دیتی ہیں، وہیں چھیڑ چھاڑ کی وارداتوں کی شکار خواتین میں متوسط طبقے کی تعداد 80 فی صد ہے۔ سب سے اہم یہ کہ اٹھارہ سال سے پچیس برس کے درمیان کے زیادہ تر ملزمین آبرو ریزی اور چھیڑ چھاڑ میں زیادہ ملوث ہیں۔ اس کے پیچھے کی حقیقت کیا ہے، اس پر ضرور ہمارے سماج کو غور کرنا ہوگا'۔9

یہ مہینہ مارچ کا ہے اور 8 مارچ جو ہمارے لیے بے حد اہم ہے جسے 1910 میں معروف سماجی کارکن کلورا جیٹکن، الیکزینڈرا کالنٹائی نے بین الاقوامی فورم میں سفارش کی کہ 8 مارچ 1907 میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی خواتین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے ہر سال 8 مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا جائے۔ مگر 108 سال پرانی تحریک کے باوجود بھی عورتوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے اور آج عورتوں کی مختاریت (Empowerment) بھی بحث کا موضوع بن چکی ہے۔ عورتوں کو جو حق دیے گئے ہیں ان میں قانونی برابری، نوکری میں برابری اور برابر اجرت ، بہتر حالات، پنچایتوں اور میونسپلٹیوں میں ریزرویشن کے ذریعے عورتوں کو حق دیا جانا شامل ہے۔ خواتین کے لیے آمدنی والی اسکیمیں اور گرانٹس کم ہیں۔ عورتوں کے خلاف تشدد بڑھتا جارہا ہے چاہے وہ نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن ہو یا پھر نیشنل کمیشن فار وومن جو عورتوں کے لیے پالیسی بناتا ہے۔ لیکن زمینی سچائی تو یہ ہے کہ کتنی بھی سفارشات اور ریزرویشن پاس ہوجائیں جب تک وہ اپنے حقوق کے تئیں بیدار نہیں ہوگی اس کے مسائل کم نہیں ہوں گے۔ 8 مارچ عالمی یوم خواتین کے طور پر ہم اس لیے نہیں مناتے کہ ہم اسے محض سالانہ تقریب کی حد تک

محدود رکھیں بلکہ ہمارا معاشرہ جو بے حد حساس ہونا چاہیے وہ خواتین کے مسائل حل کرنا اپنی اولین ترجیحات میں شامل کرے اور خواتین پر ہو رہے جرائم کے معاملے میں سخت کاروائی کی جائے۔ ان کو ان کے حقوق فراہم کرنا ہی خواتین کی مکمل آزادی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو جرائم تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں ان میں جہیز کے خلاف قانون، رحم مادر میں جنین کی جنس PCPNDT-Act 1994 غیر قانونی اور جرم ہے۔ مگر یہ کام بے روک ٹوک جاری ہے۔ اس معاملے میں ملزم کی پہچان کرنے کے لیے (F) فارموں کی جانچ کی جانی چاہیے مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قانون، باپ کی جائداد میں بیٹیوں کی حصہ داری کا قانون، گھریلو تشدد کے خلاف قانون، بال وواہ اور ستی پرتھا کے خلاف قانون اور جرائم قانون بل (Amended 2013) کا جب تک سختی سے نفاذ نہیں ہوگا عورتوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عورتوں کے لیے چلائی جارہی اسکیمیں ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے لیے سرکاری، غیر سرکاری طور پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ جب تک لوگوں کی سوچ نہیں بدلے گی، عورتوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ساحر لدھیانی نے کہا تھا:

لوگ عورت کی ہر چیخ کو نغمہ سمجھیں
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو، کہ شہروں کا رواج
جبر سے نسل بڑھے، ظلم سے تن میل کرے
یہ عمل ہم میں ہے، بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

اگر غور کیا جائے تو عورتوں سے متعلق سارے جرائم ساحر لدھیانوی کی اس بات کو سچ ثابت کرتے ہیں۔ آج کی حساس خواتین اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ ہمیں خود اپنے حالات بدلنے کے لیے آگے آنا ہوگا۔ زمانہ تو آگے بڑھ چکا ہے مگر اپنے مسائل کا حل ہمیں خود نکالنا ہوگا، تبھی معاشرہ بھی بدلے گا۔ کنارے کنارے چلنے سے منزل نہیں مل سکتی:

بھنور سے لڑو، تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلوگے کنارے کنارے

8 مارچ سال میں ایک بار نہیں بلکہ ہر دن ہمارے لیے 8 مارچ ہو۔ ہمارے اندر جو صلاحتیں پوشیدہ ہیں انھیں پہچاننے کی سخت ضرورت ہے۔ اب دنیا کو ایک متوازن خود اعتمادی سے بھرپور عورت کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال نے یہ شعر بھی خواتین کے بارے میں بہت غور و فکر کے بعد ہی کہا ہوگا

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

حواشی:

(1) National Crime Records- NCRB-IPC Bureau Indian Penal Code (IPC)

(2) لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بیگمات بھوپال کی خدمت۔ گوری شری واستو، مترجم عارف حسن کاظمی، NCERT، 2011، ص:54

(3) ماہنامہ خواتین دنیا، فروری 2018 جلد 2 شمارہ:2
خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون، خواجہ عبدالمنتقم (The Dowry Prohibition Act) ایکٹ نمبر 28 بابت 1961، ص:24-25

(4) شمیم نکہت آزادی نسواں کی جدوجہد، آج کل، ص:10-11

(5) ساما، مدیر کالندی دیش پانڈے، جنوری تا مارچ 2008، ص:27-28

(6) دسواں اتر پردیش کنونشن، اکھل بھارتیہ جنوادی مہیلا سمیتی، 28-29 اگست 2016، آگرہ، ص:7

(7) عام عورت کا سچ، سہاشنی علی سہگل، ایڈوا پرکاشن، نئی دہلی، 2007، ص:41-42

(8) شمیم نکہت، آزادی نسواں کی جدوجہد، آج کل، ص:9

(9) انقلاب، 21 نومبر 2014، مضمون نگار تاریخ داں، مصنف اور سماجی تجزیہ نگار ہیں۔

(10) اکھل بھارتیہ جنوادی مہیلا سمیتی۔ ساتویں قومی کانفرنس کی رپورٹ II 2001-2004، ص:26

(10.A) Pre- Conception and Pre-Natal Diagnostic Techniques Act (PCNDT), 1994
ہندوستان میں عورت کی حیثیت، مترجم: صغرا مہدی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1998

❑❑❑

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)

ناز آفرین

عالمی مسائلِ نسواں

ایک تجزیہ

بین الاقوامی سطح پر ہر روز تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات پر غور وخوض کیا جا رہا ہے۔ جن میں سے بیشتر مسائل کا حل بھی تلاش کر لیا جاتا ہے اور ان پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ اسی خوش فہمی میں ہر ایک کے لیے ایک دن مختص کر کے منایا بھی جاتا ہے۔ جیسے ٹیچرس ڈے، مدرس ڈے، فادرس ڈے، چاکلیٹ ڈے وغیرہ۔ اسی طرح دنیا بھر میں ویمنس ڈے منا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ طبقۂ نسواں کے مسائل حل ہو چکے ہیں یا وہ صنف نازک کہلانے والی آج ہر اُمور میں مساوی ہے۔ لیکن جب ہم از سرِ نو مسائل نسواں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے صدیوں سے جو مسائل تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ ان کا کوئی تدارک پیش نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ان مسائل کو رسمی طور پر جس طرح سے ویمنس ڈے منا کر بھول جاتے ہیں اسی طرح سے کوئی نہ کوئی قانون پاس کر کے خواتین کو خوش رکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ خواتین ابتدا سے ہی زندگی کے نشیب وفراز سے گزر کر ایک طویل سفر طے کرتی ہوئی آج اپنا اثبات کر رہی ہیں۔

مذہب اسلام نے جو حقوق خواتین کو دیے ہیں وہی آگے چل کر تانیثیت کے علمبرداروں کے بھی بنے ہیں۔ اس مقالہ کے ذریعہ ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح عالمی سطح پر طبقہ نسواں کا استحصال ہو رہا ہے؟ کیا حقیقت میں صنفی مساوات ہیں؟ اگر صنفی اعتبار سے دونوں مساوی ہیں تو کیوں آج بھی خواتین ریز رویشن کی مستحق ہیں؟ ایسے کئی سوالات ہیں اور اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر گفتگو عالمی مسائل نسواں کے تانیثی نقطہ نظر سے کی ہے۔

عربی لفظ تانیث معنی عورت، مادہ، مؤنث کی علامت سے تانیثیت بنا۔ انگریزی میں 'فیمینزم' ہندی میں 'ناری آندولن' ہے۔ 'حق' عربی لفظ ہے جس کے معنی امر، فرض، انصاف، ذمہ داری، صلہ، ملکیت ہے اور جس کا انکار ناممکن ہو۔ بنیادی انسانی حقوق تمام تر حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ فطری طور پر نوعِ انسانی کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ مرد وزن کے درمیان ایک توازن برقرار رکھنے کے لیے لازم ہے کہ جو جس کا حق ہے وہ اُسے ملے۔ مردوں نے اپنے تمام تر حقوق معاشرے سے حاصل کیے ہیں۔ خواتین ابتدا سے ہی محرومی کا شکار رہی ہیں۔ انھیں بنیادی حقوق سے دستبردار کیا گیا۔ قابل غور بات ہے کہ سوائے سویڈن، کنیڈا، ناروے، امریکہ وفنلینڈ کی خواتین کے کسی کو ملک میں ان کے حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ خواتین کے ساتھ مرد مبنی عالمی سماج نے معاشی، سماجی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی وسیاسی سطح پر مظالم ڈھائے۔ اِن حقوق کے حصول میں خواتین نے ہر مقام، ہر محاذ پر اپنے حقوق کی حصولیابی کے لیے مردوں سے بغاوت کی اور پسماندہ خواتین کے اندر اِن کے حقوق کے تئیں بے داری پیدا کی۔ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے مہمات چلائی۔ ان کا مقصد خواتین کو قدامت پرستی سے نکالنا اور فرسودہ رسومات کی جکڑ بندی سے آزادی دلانا تھا۔

عالمی مسائل

اس ضمن میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے پوری دنیا میں 10 دسمبر 1948 سے انسانی حقوق کے لیے عالمی منشور کا اعلان کیا۔ یہ حقوق

"اس ضمن میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے پوری دنیا میں 10 دسمبر 1948 سے انسانی حقوق کے لیے عالمی منشور کا اعلان کیا۔ یہ حقوق 30 دفعات پر مشتمل ہیں۔125 ملکوں میں گھریلو تشدد کے خلاف سزا کے لیے خصوصی قوانین موجود ہیں ۔ 139 ممالک میں خواتین اور مردوں کے درمیان برابری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان دفعات کی پیروی سرے سے نہیں ہوتی"

30 دفعات پر مشتمل ہیں۔125 ملکوں میں گھریلو تشدد کے خلاف سزا کے لیے خصوصی قوانین موجود ہیں۔139 مما لک میں خواتین اور مردوں کے درمیان برابری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان دفعات کی پیروی سرے سے نہیں ہوتی ۔عالمی خواتین کے مسائل پر ایک رپورٹ کا نصف حصہ ملاحظہ ہو:

'دنیا کی ہر تیسری اور جنوبی ایشیا کی ہر دوسری عورت آج تشدد کی شکار ہے ۔امریکہ میں ہر 6 منٹ کے بعد ایک عورت زیادتی کا نشانہ بنتی ہے۔ پاکستان میں ہر سال 1000 عورتیں غیرت کے نام پر قتل کی جاتی ہیں۔ہندوستان میں ہر 6 گھنٹے کے بعد ایک شادی شدہ عورت کو زندہ جلایا جاتا ہے۔ روزانہ 7000 بچیاں پیدائش سے پہلے ماردی جاتی ہیں۔ یورپ میں 14 سال سے 44 سال تک کی خواتین اپاہج ہونے کی وجہ سے گھریلو تشدد کی شکار ہیں۔جنوبی ایشیا میں 60 فیصد سے زیادہ عورتیں گھریلو تشدد کی شکار ہیں۔اسی خطے سے سالانہ ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں اسمگلنگ کی جاتی ہیں۔دنیا میں سالانہ 5 سال سے 15 سال تک کی بیس لاکھ بچیوں کو جنسی کاروبار کے لیے اسمگلنگ کیا جاتا ہے۔پاکستان میں 56 لاکھ سے زیادہ خواتین جبری مشقت پر مجبور ہیں۔80 فیصد کسی نہ کسی طرح گھریلو تشدد کی شکار ہیں۔ہر سال 26 لاکھ افراد اغوا ہو رہے ہیں۔جن میں 80 فیصد عورتیں و بچیاں ہیں۔جن کو عالمی منڈی میں کسی دوسری جنس کی طرح خرید و فروخت کیا جاتا ہے۔ان انسانوں کی تجارت سے آج ہر سال 12 بلین ڈالر سے زیادہ کا منافع کمایا جاتا ہے۔سالانہ 5 لاکھ عورتیں حمل و زچگی کے دوران مر جاتی ہیں۔دنیا بھر میں 43 فیصد صحت مند خواتین اور 51 فیصد حاملہ خواتین آئرن کی وجہ سے انیمیا کی شکار ہو جاتی ہیں۔'

(خواتین کے حقوق کا تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر جاں نثار معین، اردو دنیا، دسمبر 2012، ص:61-62)

'انسائیکلو پیڈیا آف سوشولوجی میں تانیثیت کی تعریف اس طرح ہے:

A movement that attempts to institute social,economic and political equality between men and women in society and end distortions in relationship between men and women.

اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ نسواں کا بنیادی مقصد حقوقِ نسواں کے لیے نعرہ بلند کرنا اور سیاسی، سماجی، تعلیمی، مذہبی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی ہر شعبہ میں مرد و زن کے یکساں مواقع حاصل کرنا ہے۔اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے کا عمل ہی تانیثیت ہے۔

مغربی مما لک میں تانیثیت کی کئی تھیوریز ہیں۔لیکن سنہ 1948 میں امریکہ میں حقوقِ نسواں سے متعلق پہلی بین الاقوامی خواتین کانفرنس کے زیر اثر مختلف تنظیمیں وجود میں آئیں جن کے بنیادی مقاصد حقوقِ نسواں کی مانگ تھی جس سے طبقہ نسواں کے تعلیمی، اخلاقی، تہذیبی، معاشی، سیاسی و اقتصادی حقوق پر غور و خوض کیا جانے لگا اور چند مسائل کے حل بھی نکلنے شروع ہوئے۔اس طرح دنیا بھر میں اس تحریک نے جگہ بنا لی جو مرد و زن دونوں کی فکر کو بدلنے میں معاون ہوا۔تانیثی فکر کا جائزہ لینے سے قبل عالمی مسائلِ نسواں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''رومی خاندانوں پر پدری نظام غالب تھا۔وہاں کے قانون میں عورت کی جان مرد کے رحم و کرم پر تھی۔شوہر کے انتقال کے بعد وہ بیٹوں، مرد رشتہ داروں یا خاندان کی ملکیت تصور کی جاتی تھی۔باپ اپنی لڑکیوں کو فروخت کر سکتا تھا۔خواتین کا جائیداد میں حق نہیں ہوتا تھا۔اُسی کو تقسیم کیا جاتا تھا۔غلامی عورت کا مقدر تھی۔وہ دل بہلانے کا ذریعہ تھی۔

یورپ میں مسائلِ نسواں روم جیسے ہی تھے۔خواتین کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ قانونی حقوق سے محروم تھیں۔جائیداد یا ملکیت خرید و فروخت نہیں کر سکتی تھیں۔خواتین کی آزادی مفقود تھی اور مرد اساس سماج میں عورت کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک تھا۔یورپ میں خواتین کی

ناگفتہ حالات ومسائل پر جان اسٹووارٹ مل نے لکھا ہے۔"باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا ہے بیچ ڈالتا ہے۔شادی ایک طرح تجارت تھی۔ والدین لڑکیوں کوفروخت کرتے۔وراثت میں بھی حقوق نہایت محدود تھے۔اس کی ہر چیز کا مالک شوہر ہوتا تھا۔"

(تحریک حقوق نسواں کی کارستانیاں اور اسلام،دعوت، 25 جنوری2018،ص:2(3(www.dawatonline.com)

'مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا لیکن عورت کوطلاق یا خلع لینے کی اجازت نہیں تھی۔اس کے علاوہ گرجا گھر میں نکاح کے وقت عورت سے تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا۔قدیم زمانے میں یورپ کے قانون میں عورت کی حیثیت ختم ہوگئی تھی'۔3

عربی زمانہ جہالت میں خواتین کے ساتھ برتاؤ غلاموں سے بدتر تھا۔تمام اختیارات اور حقوق مردوں کو حاصل تھے۔لڑکی کی پیدائش باعث شرم وعار سمجھی جاتی تھی۔انھیں زندہ درگور کیا جاتا تھا۔یا خرید وفروخت کی جاتی تھیں۔معاشرتی حقوق سے محروم تھیں۔مردوں کے ظلم وستم کی شکار ہو کر کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔جس سے معاشی طور پر بھی کمزور تھیں۔ اسلام کا ظہور ہوا تو عربوں نے خواتین کے حقوق وآزادی دونوں مساوی کر دیے۔ بقول کملا بھاسن 'محمدؐ نے خواتین کو صفر سے 80 فیصد حقوق دیے۔'4

چینی خواتین ناگفتہ بہ حالت میں تھیں۔مرد طبقہ نسواں پر ظلم و زیادتی کرتے تھے۔حکمراں مرد تھے جس سے خواتین محکومانہ زندگی گذارتی تھیں۔پدرسری نظام میں وہ تسکینِ جذبات کا ذریعہ بن گئی تھیں۔لڑکیوں پر تعلیم حرام ہوگئی تھی۔دختر کشی کی روایات عام ہوگئی تھی۔وہ وراثتی حقوق سے محروم ہوگئی تھیں۔بیوہ کی شادی ممنوع تھی۔انھیں نت نئے طریقوں سے جسمانی،ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں دی جاتی تھیں۔غرض کوئی ستم باقی نہیں ہوں گے جو خواتین پر آزمائے نہ جاتے ہوں۔

انگلستان کی خواتین متعدد مسائل میں مبتلا تھیں۔ان کے حقوق ایک ایک کر کے ختم کر دیے گئے تھے۔جائیداد شوہر کی ملکیت قرار دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ یہ خرید وفروخت کی جاتی تھیں۔ازدواجی زندگی بھی استحصال سے خالی نہ تھی۔مرد چھوٹی ومعمولی بات پر کوڑے برساتے تھے۔ عورت اپنے نام پر معاہدہ نہیں کر سکتی تھی۔صدیوں کی غلامانہ زندگی نے انھیں اپنے وجود سے متنفر کر دیا تھا۔

روس میں بھی خواتین کے تئیں تنگ نظریہ تھا۔حقوق مردوں کے لیے تھے۔عورت کی آزادی چھین لی گئی تھی۔تعلیم نسواں سرے سے مفقود تھی۔لڑکیوں کی شادیاں کم عمر میں کر دی جاتی تھیں جس سے امراضِ نسواں بڑھ جاتے تھے۔علاج کا کوئی انتظام نہیں تھا۔خواتین کی بشریاتی زندگی میں زدوکوب کے طریقے اپنائے جاتے تھے۔اس طرح عالمی سطح پر پدرسری نظام عام تھا۔

پاکستان میں خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک برسوں سے ہے۔ عورت پر گھریلو اور معاشرتی تشدد عام ہے۔مساوی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہیں۔اگر تعلیم نسواں کی سہولیات ہیں بھی تو معمولی سی ہیں۔ لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کی صحت پر توجہ زیادہ دی جاتی ہے جس سے بچیوں کی شرح اموات لڑکوں سے کہیں زیادہ ہے۔لڑکیوں کو ہر جگہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انھیں بچپن سے ہی نفسیاتی طور پر تیار کیا جاتا ہے کہ باپ، بھائی یا شوہر کی بات ماننا ہی اس کا فرض ہے جب کہ خود کفیل خواتین امورِ خانہ داری کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔خواتین دورانِ سفر بھی متعدد مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔گھر سے باہر نکلتے ہی انھیں کئی طرح کی دشواریاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔گھر والے بھی اس کی پاک دامنی پر شک کرتے ہیں۔

کامریڈ صبغت کے مطابق 'ہمارے ارد گرد دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جو کہ کہتے ہیں کہ خدا نے مرد کو حاکم بنا کے پیدا کیا ہے۔یہی عورت کی قسمت ہے کہ وہ مرد کی غلامی کرے۔ دوسرے وہ جو کہ مسائل نسواں کا ذمہ دار مرد کو ٹھہراتے ہیں اور عورت کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ پہلے لوگ قدامت پرست اور بنیاد پرست تھے۔ دوسرے لبرلز، آزاد خیال اور فیمی نسٹوں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مارکسسٹ آزادیٔ نسواں کی بات کرتے ہیں، لیکن ہماری آزادی کا مفہوم وہ نہیں جو کہ بورژوا لبرلز کا ہے کہ عورت کپڑوں سے آزاد ہو جائے اور مردوں سے آزاد ہو جائے وغیرہ۔ بلکہ وہ معاشی طور پر آزاد ہو۔وہ باعزت روزگار حاصل کر سکے۔اسے نقل وحمل کی مرد کی طرح آزادی ہو۔جس طرح ہمارا جسم اعضا پر مشتمل ہے۔ اگر تمام اعضا ایک کلیت میں کام کرنے کی بجائے اپنی اپنی کرنے لگیں تو انسان کچھ بھی نہ کر سکے گا۔اسی طرح مرد وزن قدرت لازمیت میں بندھے ہیں۔گو کہ مرد وزن حیاتیاتی طور پہ مختلف ضرور ہیں لیکن فرد کے اعتبار سے یکساں ہیں۔عورت کی تاریخی شکست اس لیے ہوئی تھی کہ اس کا پیداوار سے راست تعلق توڑ دیا گیا تھا۔لیکن عورت کے بغیر پیداوار ناممکن ہے۔'4

سرگرم خواتین

انقلاب فرانس کے اولین دور 1789 میں نیشنل اسمبلی میں

خواتین کی جانب سے ایک پٹیشن داخل کیا گیا۔ یہ خواتین 'حقوقِ نسواں' کی علم بردار بن کر ابھریں لیکن انھیں پٹیشن پر بحث کی اجازت نہیں ملی۔ Olymp De Gouges نے اپنی ایک حامی Queen Marie کو خط لکھ کر حقوقِ نسواں کی تائید کی درخواست کی۔ دو خواتین نے فرانس میں "Society of Revolutionary Republicaticans" کی بنیاد 1793 میں رکھی۔ ان میں Claire Locombe اور Fouline نے نمایاں کردار ادا کیا۔

تانیثیت کی حامی خواتین اراکین کی تعداد 200 تھی۔ فرانس میں 1871 میں "Women's union for the Defence of personal Care of the Injured" نے مسائلِ نسواں کو دور کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس یونین نے صنفی مساوات، مساوی اُجرت، طلاق کا حق، اعلیٰ تعلیم کا حق، ملازمت کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ اور قحبہ گری پر قانونی طور پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ سماجی مسائل کے حل کے لیے کئی اقدامات اٹھائے۔ جن خواتین نے حق رائے دہی کی تحریک چلائی اسے "Suffragettes" کا نام دیا گیا۔

HC Chak lader. Social life in Ancient India, Faislabad-1,1987.p:89

مستقل کوششوں کے بعد 1944 میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ اِس طرح خواتین کو بھی مکمل شہریت حاصل ہوگئی۔ کافی احتجاج کے بعد حکومتی اداروں میں کم رتبہ اور کم درجہ کی ملازمتیں دی جانے لگیں۔ لیکن خواتین پر جنسی جبر کے نتائج میں تولد (اولاد) کی پرورش کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ایسے میں "US-Women's Lib Movement" نے خواتین کے اسقاطِ حمل، منعِ حمل اور مانعِ حمل ادویات خریدنے کی قانونی اجازت طلب کی۔ اس کا باضابطہ ایک Manifesto-343 تیار ہوا۔ جس میں سینکڑوں فرانسیسی خواتین کے ساتھ Simon de Beauvoir بھی شامل ہوئیں۔ فرانس میں 1960 کے زمانے سے تانیثی تحریک سرگرم ہوئی جو آج بھی حقوقِ نسواں کے لیے عمل پیرا ہے۔

امریکہ میں مردوں کی محکومیت، غلامی، غیر شہریت، حق رائے دہی اور املاک سے محرومی، ظلم، جبر، دہشت اور عدم تحفظ کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی کے اختتام پر احتجاج کی صورت پیدا ہوئی۔ یہی اسباب امریکہ میں تانیثی تحریک کے محرک بنے۔ اس وقت تک صرف چند خواتین سلائی، گانا، بجانا اور فرانسیسی زبان سے واقف تھیں۔ 1833 میں 20 خواتین پر مشتمل "Anti Slavery Society" نے مقاصد کے علامیہ پر دستخط چاہیں پر انھیں اجازت نہیں ملی تو احتجاجاً انھوں نے اپنی "خود مخالف غلامی سوسائٹی برائے خواتین" تشکیل دی۔ اس کی مخالفت میں ان پر بڑے مظالم ڈھائے گئے۔

1840 میں مندوبین کی حیثیت سے لندن میں مخالف غلامی کنونشن منعقد کیا۔ اس کنونشن میں Elizabeth,lucy stone Lecritamott, اور Susan B Anthony نے مندوبین کی حیثیت سے شرکت کی لیکن انھیں آگے نہیں بیٹھنے دیا گیا۔ اس حقارت آمیز رویے نے ان میں نیا حوصلہ پیدا کیا۔ 1848 میں "Women's Right Convention" منعقد کیا گیا۔ جسے "Seneca Fall Convention" بھی کہا جاتا ہے۔ جس میں سماجی، معاشی اور قانونی اختیارات اور امتیازات پر عہد لیا گیا کہ ان امتیازات کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن ذرائع استعمال کریں گے۔ کنونشن کا نعرہ "تمام مردوں اور خواتین کی تخلیق مساویانہ ہوئی ہے" تھا۔ سڑکیں صاف کرنے والیوں کو مخصوص لباس پہننے پر مخالفت کی گئی۔ انھیں نیم مردانہ لباس دیا گیا۔ ان مقلدین کو "Bloomers" کہا گیا۔ 1833 میں برلن میں پہلا مخلوط کالج قائم ہوا۔ 1841 میں خواتین کو پہلی دفعہ گریجوٹس کی ڈگری دی گئی۔

1 8 5 0 کے بعد خواتین بھی صنعت کاری میں داخل ہوئیں۔ Sarah Begle اور ان کی ہم خیال خواتین کی کوششوں سے ملازمت کرنے والی خواتین کو مردوں کے بالمقابل مشاہرے ملنے لگے۔ کام کے درجے میں بھی بہتری آئی۔ "American Women Suffrage Association" کا ترجمان "Womens's Journal" لوسی اسٹون کی ادارت میں نکلا "Anti Slavery" جس نے حق رائے دہندگی کی مہم چھیڑی۔ 1870 میں Utah کی خواتین کو ووٹ کا حق حاصل ہوا۔ 1903 میں "National Women's Trade Union League" کی وجہ سے خواتین کے تحفظ لیبر قوانین بنے اور کام کے اوقات مقرر ہوئے۔ امریکی خواتین کے مسائل حل کرنے میں 'سائنس'، 'فیمنسٹ اسٹڈیز'، 'مطالعات نسواں' اور 'مطالعات نسواں انٹرنیشنل' رسائل و جرائد نے اہم کردار ادا کیے۔ "Women's Studies" کے قیام نے خواتین کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق کا حل پیش کیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک برطانیہ میں خواتین کے لیے تعلیم کا مکمل انتظام نہیں تھا۔ صرف ثانوی درجے کی تعلیم تھی۔ جان اسٹورٹ مِل کی اہم تصنیف "The Subjection of Women" (1869) میں ان روایات پر سخت تنقید کی گئی تھی جن کی بنیاد پر خواتین کو

کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اِن میں ان کے شخصی حقوق کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ کئی اسکول قائم کیے گئے۔ Oxford اور Cambridge میں خواتین کے لیے کالج کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس طرح شادی کے بعد بھی بیٹیوں کو وراثت میں حصہ ملنے لگا۔ خواتین کو ملکیت رکھنے کا قانون چند برسوں کی کوشش سے پاس ہوگیا۔ اسی دور میں نظریاتی طور پر صنفی مساوات کی آواز بھی گونجی۔ حق رائے دہی کا پُرزور مطالبہ کیا گیا۔ اس ضمن میں Fawcet Millicent نے پُرامن طریقے سے پدرسری نظام کو باور کرانے کی کوشش کی:

"جب خواتین گھریلو امور بہ خوبی انجام دیتی ہیں۔ پارلیمنٹ قانون بناتی ہے تو خواتین اسے مانتی ہیں۔ اس لیے ان قوانین کے بنانے میں خواتین کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ اُس نے منصوبہ ساز عہدوں پر خواتین کی شمولیت کو بھی ناگزیر قرار دیا۔ اُس نے یہ بھی بحث کی کہ خواتین کو مردوں کے برابر ہی ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ باوجود ان سب کہ انھیں ووٹ دینے کا حق نہیں دیا گیا۔ جب کہ ایک غریب مزدور کو بھی ووٹ کا حق حاصل تھا۔5"

HC Chak lader. Social life in Ancient India.

Faislabad-1,1987.p88

برطانیہ میں خواتین نے حق رائے دہی اپنی جانیں دے کر حاصل کی۔ جون 1913 میں اہم موڑ آیا جب Emily widing davison نے بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دیا۔ اس سے قبل حق رائے دہی کے لیے دو بہنوں نے 1903 میں "Women's social and political union" کی بنیاد ڈالی۔ بالآخر 1918ء میں ایک قانون بنا جو اصلاحات کے نام سے جانا گیا۔ اس کے مطابق مرد بیس برس اور عورت تیس برس کی عمر میں رائے دہندہ بن سکتی ہے۔ گو کہ یہاں بھی حق تلفی کی گئی۔ 1928 میں "قانون عوامی نمائندگی" ایکٹ منظور ہوا۔ جس کے تحت عورت اکیس برس کی عمر میں رائے دہندہ بن سکتی ہے۔ تحریکِ نسواں نے آگے چل کر سیاسی، سماجی اور معاشی شعبوں میں کامیابی حاصل کی۔

جرمنی میں اٹھارہویں صدی تک خواتین پژمردگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اِن کے حقوق سلب کر لیے گئے تھے۔ ان کا کام صرف تولید تک محدود تھا۔ چند خواتین جو اعلا خاندانوں سے تھیں وہی مختصر علم حاصل کر سکتی تھیں۔ انتہا یہ تھی کہ جنس کی بنیاد پر تعلیمی نصاب تیار کیا جاتا تھا۔

1847 میں Louise otto peters نے اپنی کتاب "Feminine sphere in affairs of the state" میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم بالخصوص ایسی تعلیم کی مانگ کی جو سماج کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کرے۔ اس نے معاشی طور پر خواتین کو مستحکم کرنے کے لیے تکنیکی تعلیم سیکھنے پر بھی زور دیا۔ Luise Buchner اور Fammy Lewald نے لڑکے اور لڑکی کی یکساں تعلیم کی حمایت کی۔ خواتین کو ذمہ دار شہری کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ خواتین کی مسلسل کوششوں کے عوض ان کی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کے اجتماعات کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور کچھ کو گرفتار کر لیا گیا۔

اِن مخالف حامیِ نسواں نظریات کے خلاف خواتین قلم کاروں نے بیداری کی مہم چلائی۔ یہ اپنے حقوق کی بہترین ادائیگی کے ساتھ بہترین شریک حیات کے فرائض پورے کرنے پر زور دیتی تھیں۔ ان کی خدمات کو "Labour and Love" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ 1884ء میں جرمنی میں ہونے والے انقلاب نے ملک میں متعدد تحریکیں قائم کر دیں۔ ان میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک کو مزید فروغ دینے کے لیے جرمن کیتھولک کمیونٹی نے "Women's educational Association" کی بنیاد ڈالی۔ تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی گئی تو وہیں خواتین کی لیے 1850 میں ایک یونی ورسٹی قائم کی۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے Carl Frobel نے علاحدہ اسکول قائم کیا۔ ان سیاسی اداروں کو خواتین کے لیے بھی کھول دیا گیا جن میں صرف مردوں کو جانے کا حق تھا۔ 1860 کے بعد لڑکیوں کے لیے تربیتی اسکول شروع کیے گئے۔ اِسی دَور میں خواتین کی آزادی کے دو طرح کے نظریات قبول کیے گئے۔ Loise Aston اور George Sand جیسی خواتین مردوں کی طرح زندگی گزارنے کے نظریے کو رد کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں خواتین کی نسائی خصوصیات سے انکار دراصل قدرت کی دی گئی خصوصیات سے انکار ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست ہوئی تو 1919 میں "Weimar Constitution" دستور بنا جس نے خواتین کو ووٹ کا حق دیا۔ اس اجازت کے پس منظر میں چند خواتین کی کوششیں اور قربانیاں کارفرما تھیں۔ خواتین صحافی Reuter Gabridge نے اپنے ناول میں خواتین پر عائد کردہ پابندیوں کی مخالفت کی۔ حق دہی کو ضروری قرار دیا۔ جرمنی میں غیر شادی شدہ جوڑوں کی من مانی، جنسیت نگاری، اسقاط حمل اور ناجائز اولاد پر مختلف انداز میں مباحث ہوئے۔ انھیں قانوناً صحیح ماننے کی حمایت کی گئی۔ 1970 میں جرمنی میں خواتین کو چڑیل ماننے کے

> "عالمی مسائل نسواں موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے کیونکہ نصف حصہ خواتین یعنی آدھی دنیا مسلسل جنس کی بنیاد پر استحصال کی شکار ہو رہی ہے۔ جب کہ عورت تخلیقی قوتوں کی مالک بھی ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر شعبہ میں عدل کریں ، انصاف کریں سازگار ماحول میں اس کی شخصیت کو پروان چڑھنے کے مواقع دیں تاکہ مستقبل میں یہ بھی آزادانہ اور مساویانہ زندگی گزار سکیں۔ عورت کی کامیابی میں ہی مرد کی کامیابی ہے"

خلاف تحریک چلائی گئی۔ اس ضمن میں "Take black the night" نے خواتین پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ پدرسری نظام کی بھی مخالفت کی۔ خواتین کے تحفظ کے لیے کئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اس طرح دانشور خواتین کی کوششوں سے جرمنی میں تانیثی فکر عام ہوگئی۔ مجملہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے سماجی و سیاسی حالات و حادثات وواردات نے تانیثی مسائل پر مختلف زاویوں سے اثر ڈالا ہے۔ خواتین کی ابتری درحقیقت اس وقت نئے ایام میں داخل ہوئی جب بین الاقوامی کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی۔ اگرچہ مسائل اب بھی ہیں نیز اس پر نصف قابو پایا جاچکا ہے۔

مفروضہ:

1. عالمی سطح پر مسائل نسواں یکساں ہیں۔
2. پدرسری نظام نے حقوقِ نسواں دبائے رکھے ہیں۔
3. تحریک نسواں نے عالمی سطح پر مسائل نسواں کی نشاندہی کر کے اس سے آگہی پیدا کی ہے۔

مقاصد:

1. عالمی مسائل نسواں کی نشاندہی کر کے ان کی بنیادی وجوہات معلوم کرنا۔
2. حقوقِ نسواں کے لیے مثبت اور منفی اقدامات کا جائزہ لینا۔
3. تحریکِ نسواں کی بنیادی فکر کا احاطہ کر کے مسائل نسواں کا اجمالی جائزہ لینا۔

خلاصہ:

تحریک نسواں نے بین الاقوامی سطح پر آزادئ نسواں کی بیداری پیدا کی۔ مسلسل جدوجہد نے خواتین کے عالمی مسائل سے تو کچھ حد تک آگہی پیدا کر لی ہے۔ چوں کہ اس سے قبل مرد اساس سماج نے انھیں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھ کر ان پر جس قدر مظالم ڈھائے ہیں اس کو مقالہ میں پیش کیا جاچکا ہے۔ اس بات پر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح فرد کے اعتبار سے مرد و زن دونوں مساوی ہیں اور دونوں کے لیے یکسانیت برتنی چاہیے۔ بالخصوص حقوقِ نسواں سے آگہی کے لیے پدرسری نظام کی ذہن سازی کرنی ہوگی۔ ان کی ذہنیت کو بدلنے کے لیے صنف نازک کے حقوق و آزادی مربوط و مدلل انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

تجاویز

1. بین الاقوامی سطح پر مسائل نسواں رنگ و روپ، ذات، حیثیت، خاندان، علاقہ اور معیشیت کی بنیاد پر ایک جیسے ہیں۔
2. پدرسری نظام نے حقوقِ نسواں کو دبائے رکھا ہے۔
3. مرد اساس معاشرہ نے طبقہ نسواں کی آزادی چھین رکھی ہے اور عملی طور پر وہ خواتین کے دل و دماغ پر قابض ہیں۔
4. عالمی سطح پر آج بھی خواتین کی نفسیات پر مرد معاشرہ غالب ہے۔

عالمی مسائل نسواں موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے کیونکہ نصف حصہ خواتین یعنی آدھی دنیا مسلسل جنس کی بنیاد پر استحصال کی شکار ہو رہی ہے۔ جب کہ عورت میں بہت سی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اس کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر شعبہ میں عدل کریں، انصاف کریں، سازگار ماحول میں اس کی شخصیت کو پروان چڑھنے کے مواقع دیں تاکہ مستقبل میں یہ بھی آزادانہ اور مساویانہ زندگی گزار سکیں۔ عورت کی کامیابی میں ہی مرد کی کامیابی ہے۔

□□□

Naaz Aafreen
Senior Research Scholar,
Dept. of Urdu
Ranchi University
Ranchi-834009 (Jharkhand)

گلشن آرا

مادری زبان کی اہمیت اور والدین کی ذمّہ داریاں

بقول داغ دہلوی۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

دنیا کی کوئی بھی زبان اس وقت تک مر نہیں سکتی جب تک اس زبان کے بولنے اور لکھنے والے افراد موجود ہوں۔ گویا زبان زندگی بھی ہے اور بندگی بھی۔ بندگی اس معنی و مفہوم میں کہ ہم سب مذہب کی اصل خوشبو اپنی مادری زبان ہی میں محسوس کر سکتے ہیں۔ ہر مقام و منزل پر ہم نیت تو اپنی زبان میں ہی ادا کرتے ہیں اور اللہ رب العزت ہر انسان کی نیت سے بخوبی واقف ہے۔ اردو زبان کی تاریخ بھی ایک زندہ روایت کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ بے شمار لوگوں نے نہ صرف اردو زبان کو برسوں سینے سے لگایا بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں عہد ساز علمی و ادبی کارنامے بھی انجام دیے۔ اردو ایک زندہ و تابندہ اور عالمی زبان ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک کے حصوں میں اردو بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے اور آج بھی اپنے وطن عزیز میں کشمیر سے کنیا کماری تک اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب اپنی اس پیاری اور انمول زبان اردو کو زندہ رکھنے اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ہر سطح پر سنجیدہ ہوں۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اس زبان نے ہر عہد میں تاریخ ساز علمی و ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو ہندوستان کی خوبصورت مشترکہ تہذیبی وراثت ہے، جسے ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں سجا سنوار کر ورثے میں دیا ہے۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس امانت کو پوری ایمان داری کے ساتھ اگلی نسلوں میں منتقل کریں۔ ہمیں اردو سے سچی اور عملی محبت کرنی چاہیے۔ بہار میں اردو سرکاری عوامی سطح پر نظر انداز ہو رہی ہے۔ اس کے لیے ہمیں کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسکولوں میں اساتذہ کی کمی ہے اور وقت پر اردو کتابیں مہیا نہیں کی جاتی ہیں۔

اردو آبادی کو چاہیے کہ اردو میں درخواست دیں۔ اگر وہ درخواست کم دیں گے یا نہیں دیں گے تو اردو ملازمین کی معنویت و اہمیت کم ہوتی جائے گی۔ ہمیں اس کمی کو دور کرنے کے لیے سیمینار منعقد کرنے چاہیے اور اس کے ساتھ اردو عمل گاہوں یعنی ورکشاپ کے انعقاد کے ذریعہ اردو ملازمین کو ان کی منصبی ذمہ داریوں کے تئیں بیدار کرنے کے ساتھ ان میں اردو کا کام کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ کو اردو کی ترقی اور ترجمہ کے کاموں میں بہتری لانے کے لیے سہ لسانی دفتری اصطلاحی لغت کی تدوین کرانے کی ضرورت ہے جو بہت ہی بنیادی اور اہم کام ہے۔ اردو قارئین کی تعداد بڑھانے اور انھیں اردو پڑھنے کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسکولوں میں اردو

لائبریری قائم کی جائے اور اردو سیمینار میں مدارس اسلامیہ کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے۔ مدرسوں میں زیادہ تر دیہی علاقے کے غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے طلباء وطالبات پڑھتے ہیں۔ اس لیے انھیں مفت کتابوں کی فراہمی سے ان کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی امداد بھی ہوگی۔ طلباء وطالبات کو بہار ٹکسٹ بک کارپوریشن کے ذریعہ شائع شدہ کتابیں مفت مہیا کرائی جائیں تاکہ اردو زبان کے طلباء وطالبات کی تعلیمی حوصلہ افزائی ہوسکے۔ ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کی ترقی وفروغ کی راہیں مزید ہموار ہوسکیں گی۔

میرے خیال میں بچوں کی ذہنی نشوونما اور عملی تربیت کے لیے علمی و ادبی تقریبات میں خاص موضوعات پر انھیں بولنے کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں، جس سے بچوں کی ذہنی صلاحیت اور جوہر کو سامنے لایا جاسکے۔ چھوٹی بڑی ادبی نشست کا انعقاد کرکے ان کی ذہنی پرورش و پرداخت کی جاسکتی ہے۔ اساتذہ اپنی درس گاہوں میں شعروادب کی محفل آراستہ کرکے بچوں میں ذوق وشوق کو آسانی سے پروان چڑھا سکتے ہیں۔ یہ عہد سائنس و ٹیکنالوجی کا ہے اس سے بھی ہم بچوں کو بھرپور فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

اسکولوں کی طرح مدرسوں کے طلبا وطالبات کو بھی مفت کتابیں فراہم کرنے سے اردو آبادی کا حکومت پر اعتماد مضبوط ہوگا۔

اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ سبھی ملی اور اردو اداروں میں اردو زبان میں کام ہونا چاہیے۔ آپسی مشورے اور تعاون سے اردو کی ہمہ جہت ترقی اور فروغ کی راہیں ہموار ہوں گی اور اردو ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور بلندی حاصل کرسکے گی۔ دنیا کی بہت سی زبانیں اپنے محدود و مخصوص وسائل کے باوجود اپنی زبان میں اعلیٰ ادب تخلیق کررہی ہیں۔ اپنے وطن عزیز میں بھی بنگلہ، تمل، تیلگو، ملیالم زبانوں میں عالمی ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زبانوں میں عالمی ادب کا بھرپور ترجمہ کرکے اپنی زبان کو عالمی ادب کے مدمقابل کھڑا کردیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو سے محبت کرنا سیکھیں۔

ثانوی سرکاری زبان اردو کے عملی نفاذ کے سلسلے میں کئی نوٹیفکیشنس (Notifications) بھی جاری کیے گئے ہیں لیکن 1981ء میں ثانوی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود اردو ابھی اپنے آئینی حق سے محروم ہے، جب ایک اردو آبادی مادری زبان کے تئیں خود بیدار اور متحرک نہیں ہوگی، خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوگی تب تک اردو زبان فروغ نہیں پاسکے گی۔

اردو دیوس، 15 اگست، 26 جنوری اور دیگر سرکاری تقریبات کے موقعوں پر دعوت ناموں اور ہورڈنگ وغیرہ میں اردو زبان کو سرے سے نظر انداز کردیا جاتا ہے حالانکہ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو بھی سرکاری سطح پر مناسب جگہ ملنی چاہیے۔ اردو کی ترقی وترویج کے لیے

ایک نگہداشت کمیٹی بنا کر مضبوط اردو تحریک شروع کرنے اور بچوں کو اردو زبان کی تعلیم کی طرف والدین کو راغب کرنے کے لیے بحث ومباحثے کی ضرورت ہے۔

ہماچل پردیش، پنجاب اور اڑیسہ میں اردو کا امتحان پاس کرنے والے سرکاری ملازمین وافسران کو ایک سے زائد انکریمنٹ (Increment) دیا جاتا ہے۔ لہٰذا حکومت بہار کو بھی ثانوی سرکاری زبان اردو کی ترقی اور ترویج کے پیش نظر بہار میں بھی ایسا کرنا چاہیے۔ عوام کے تعاون سے ہی اردو زبان کا عمل نفاذ اور اس کی ترقی وترویج ممکن ہو سکے گی۔

حکومت نیک نیتی کے ساتھ اردو زبان کی بہتری اور فروغ کے لیے بہت سارے منصوبے بناتی ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے اردو آبادی کو بیدار رہنا ہوگا۔ دلی، یوپی، جھارکھنڈ، بہار اور مغربی بنگال یعنی شمالی ہند کی دوسری سرکاری زبان اردو ہی ہے۔ ان ریاستوں میں اردو کا فروغ ہونا چاہیے لیکن حالات اس کے برعکس ہیں۔ ہمیں ایک منصوبہ بند، منظم اور مدت بند لائحہ عمل تیار کر کے اس پر عملی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم اب بھی فرسودہ روایات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کے بدلتے ہوئے مزاج ومیلان اور لسانی تبدیلیوں سے بھی ہم اپنے آنے والی نسلوں کو سیراب وفیضیاب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے بچوں کو گھر کی فضا میں مذہب کے ساتھ تھوڑا سا وقت اپنی مادری زبان سیکھنے اور سکھانے میں صرف کریں تو بہت ہی فائدہ ہوگا۔

اردو زبان کے سلسلے میں ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ زبانیں ماں کی گود میں ہی پلتی ہیں اور تعلیم گاہوں میں سنورتی ہیں۔ تب جا کر یہ اہل زبان کے دلوں میں دھڑکتی ہیں۔ لہٰذا اردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں کوشش کرتے ہوئے خواتین اور لڑکیوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ انھیں ترجیح دینا چاہیے۔ اردو پڑھی لکھی ماں کی گود میں پلنے والی اولاد ضرور اردو پڑھ لے گی۔ ایک خاتون کی اردو تعلیم خاندان میں اردو تعلیم کی ضمانت ہے۔

اردو ادب کے باشعور والدین حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں ضرور پڑھائیں لیکن اردو کی واجبی تعلیم کے لیے گھر پر مناسب انتظام ضرور کریں اور اپنی مادری زبان سے نئی نسل کو علاحدہ نہ ہونے دیں کیوں کہ اردو ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ہماری شناخت اور پہچان بھی ہے۔

ماہرینِ لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان اپنی مادری زبان کے وسیلے ہی سے دوسری تمام منزلوں اور مرحلوں کو بہ آسانی طے کرتے ہیں اور ترقیات اور فتوحات کے نئے دریچے کھولتے ہیں۔ کوئی بھی زبان ہو وہ بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے ہی زندہ رہتی ہے۔ زبانیں دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں سے بھرپور استفادہ کر کے ادب میں بلند مقام ومرتبہ حاصل کرتی ہیں۔ اردو زبان ملک کی شیریں، دلکش اور سیکڑوں برسوں کی ریاضت اور محنت ومحبت کی مشترکہ قومی وراثت اور امانت ہے۔ اس زبان کو تمام مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے لہو سے سینچا اور سنوارا ہے۔ اردو نے ملک کی آزادی میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے نغموں اور نعروں نے ملک کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ''انقلاب زندہ باد''، جیسے اردو کے لفظ کو ملک کی تمام زبانوں نے اپنے ادب میں جگہ دے کر اس زبان کی عظمت واہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہمارا فرضِ اولین ہے کہ ہم اپنے بچوں کو موجودہ جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں مگر اس کا بھی خیال رہے کہ آنے والی نسل اردو زبان سے ہرگز دور نہ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین اپنے بچوں کو گھر کی فضا اور ماحول میں دین کے ساتھ ساتھ اپنے اس قیمتی ورثہ اردو زبان کو بھی ہر حال میں زندہ رکھیں۔ مذہب کو سمجھنے اور برتنے کے لیے بھی ہمارا اردو جاننا اور پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے ہم سب اپنی زبان اردو کو روزمرہ کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بنائیں اور بزرگوں کی اس امانت کو آگے کی نسلوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیں۔

◻◻◻

Gulshan Ara
C/o. Dr. M. M. Ansari
Madarsa Road, Maripur,
Muzaffarpur - 842001 (Bihar)

محمد نہال افروز

عصر حاضر کے اردو افسانوں میں نسائی مسائل کی عکاسی

عصر حاضر کے اردو افسانوں میں جہاں بہت سے مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں وہیں نسائی مسائل پر بھی خاصی گفتگو ہوئی ہے۔ دور حاضر کے اردو افسانوں میں خواتین کے مسائل، خواتین کی طرز زندگی اور مرد کے ساتھ عورت کا رویہ بھی تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں بیسویں صدی کے افسانوں کی طرح عورت بے بس، مجبور، مظلوم اور مرد کی غلام نہیں ہے۔ عصر حاضر کے افسانوں میں عورت کے کردار کو کمزور نہیں بلکہ طاقت ور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اندر خود اعتمادی، خود مختاری، مرد کے شانہ بشانہ چلنے کا حوصلہ، ہمت، جرأت اور حالات کا سامنا کرنے کی قوت میں شدت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

''نسا'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی اردو لغات میں جنسِ اناث، عورتوں کی جنس، خواتین، عورتیں، بیبیاں، ناریاں، وغیرہ درج ہیں۔ لغات میں نسا کے مختلف معنی ضرور درج ہیں، لیکن ہر معنی کا مطلب ایک ہی ہے یعنی کہ عورت۔ عورت کی زندگی میں مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں۔ کہیں پر معصوم لڑکیاں ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ کہیں پر شوہر اپنی بیوی کو غلام بنا کر رکھتا ہے۔ اس وجہ سے مرد اساس معاشرے میں رہنے والی عورتیں کبھی کبھی صدائے احتجاج بلند کرنے لگتی ہیں۔ کیوں کہ آج کی عورت اگر ایک طرف پیار و محبت، رحم دلی، سخاوت، ممتا سے کام لیتی ہے تو دوسری طرف وہ ترقی کی منزلیں بھی تیزی سے طے کر رہی ہے۔ خواتین سے جڑے مسائل کو موضوع بنا کر عصر حاضر کے اردو افسانہ نگاروں نے بہت سے افسانے قلم بند کیے ہیں۔

ذکیہ مشہدی کا شمار دور حاضر کے سینئر اور معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل پر متعدد کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ انھوں نے افسانہ ''ایک تھکی ہوئی عورت'' میں لڑکا اور لڑکی کی محبت کی کہانی کو موضوع بنایا ہے، اس افسانہ میں دونوں شادی سے پہلے بہت خوش رہتے ہیں، لیکن شادی کے بعد شوہر اپنی بیوی پر ظلم کرنے لگتا ہے۔

وسندھرا اور اجے ایک دوسرے کو کالج کے دنوں سے ہی جانتے تھے۔ وسندھرا لٹریچر کی طالبا تھی اور اجے سائنس کا طالب علم تھا۔ اجے وسندھرا کے بھائی بمل کا دوست ہے جو شام کو اکثر ملنے اس کے گھر آیا کرتا ہے۔ وسندھرا چھپ چھپ کر اجے کو دیکھتی ہے اور چائے ناشتے کے بہانے اس سے خوب باتیں کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ وسندھرا کو اجے سے عشق ہو جاتا ہے۔ اجے کو جب وسندھرا کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ''تو سمجھتی ہے کہ محبت صرف لٹریچر والے ہی کر سکتے ہیں۔ کیا بایو کیمسٹری پڑھنے والوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔'' دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ شادی کے پہلے دونوں میں بہت پیار تھا، لیکن شادی کے بعد نہ جانے اجے کو کیا ہو جاتا ہے کہ وہ وسندھرا کا خیال ہی نہیں رکھتا۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ وسندھرا کو لگنے لگتا ہے کہ اجے اب مجھے پیار نہیں کرتا۔ وہ سوچنے لگتی ہے کہ کیا شادی کے بعد ہر مرد ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''..........اب اگر کسی سے وسندھرا کہے کہ وہ چاہتی ہے کہ

اجے اسے پکارے تو اس کی آواز میں وہی شہد ہو، جو اظہار محبت کے پہلے کنوارے بولوں میں تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے تو آنکھوں میں دیپ جل اٹھیں۔ وقت بے وقت وہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دے۔ جسم کی طلب نہ ہو تو بھی اسے پیار کرے، تو پتہ نہیں فیصلہ وسندھرا کے حق میں ہوگا یا نہیں۔ اجے سے وہ یہ سب کہتی ہے تو جواب ملتا ہے تم فلم زدہ ہو۔ میں کیا فلمی گیت گاؤں تب ہی تم سمجھوگی کہ تم سے پیار کرتا ہوں۔ وسندھرا سن سے ہو جاتی۔ دل کے اندر کچھ ٹوٹ سا جاتا۔...........وسندھرا کو شدید جھنجھلاٹ ہوتی ہے مگر آنسو پیتی وہ اجے کی پشت سے چپٹ کر سونے کی کوشش کرتی ہے۔ شادی کے بعد ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔..........''

(ذکیہ مشہدی، پرائے چہرے، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ 1984، ص40)

لیکن اس کا جواب کہیں نہیں ملتا کہ کیا شادی کے بعد ہر مرد ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک ہی سہیلی تھی مدھو، جس سے وہ پوچھنا چاہتی ہے کہ کیا شادی کے بعد سارے مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، مگر یہ سوچ کر نہیں پوچھتی کہ اسے خود ہی اپنے شوہر کی پرواہ نہیں ہے۔ اپنی ماں سے بھی نہیں پوچھ سکتی ہے، کیوں کہ شادی کے پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنے داماد کو نیک، کماؤ اور بیٹی کا بہت خیال رکھنے والا ہی سمجھتی تھی، لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ اجے پہلے جیسا نہیں تھا بہت بدل گیا تھا۔ وہ سوچتی تھی اس سے تو اچھا ہوتا کہ شادی ہی نہ کرتے، کم سے کم اس کا پیار تو باقی رہتا، لیکن وہ دن وسندھرا کی زندگی میں اب کبھی نہیں آنے والا تھا۔

ہمارے معاشرے میں عورت ایک object کے طور پر دیکھی گئی ہے۔ یہ معاملہ آج بھی اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی کو موضوع بنا کر نگار عظیم نے افسانہ ''روشنی'' لکھا ہے۔

''روشنی'' ایک ایسی کہانی ہے، جس میں عورتوں سے متعلق موجودہ دور کے اہم مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کردار سنیتا ایک چھوٹے قد کی لڑکی ہے، جس کے ماں باپ غریب ہیں۔ وہ لوگ بیٹی کے مقابلے میں اپنے بیٹوں پر زیادہ پیسے خرچ کرتے ہیں۔ سنیتا کو بچپن ہی سے ہر بات پر کمتر سمجھا جاتا تھا، کیوں کہ وہ ایک لڑکی تھی۔ اسے کہا جاتا تھا کہ لڑکیوں کے مقدر میں گھر سنبھالنا ہی ہوتا ہے۔ ماں باپ کے گھر بھی اور دوسرے کے گھر بھی۔ سنیتا بھی اسی کو اپنا مقدر سمجھ کر زندگی گزارتی رہتی ہے۔ سنیتا کی جب شادی کی عمر ہوتی ہے تو کئی رشتے آتے ہیں، لیکن غریبی اور زیادہ خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے اس کا رشتہ نہیں ہو پاتا ہے۔ رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں تناؤ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھا جانے لگتا ہے۔ بھائیوں نے بھی اسے اپنی نظروں سے گرا دیا۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن نریندر کا رشتہ آیا۔ وہ کسی کپڑے کی دکان پر سیلز مین تھا۔ اس نے سنیتا کو پسند کر لیا، لیکن بات یہاں آکر رک گئی کہ نریندر کے گھر والوں کو ایک نوکری پیشہ لڑکی چاہیے تھی۔ اس پر لڑکی کے باپ نے کہا سنیتا نے بی۔ ایڈ کیا ہے۔ نوکری کے لیے درخواست بھی دی ہے۔ اس کی نوکری جلدی ہی لگ جائے گی۔ آپ رشتہ پکا کیجیے، لیکن یہ بات سنیتا کو پسند نہ آئی۔ اس نے کہا ان کو میری ضرورت نہیں ہے بلکہ انھیں ایک ایسی لڑکی چاہیے، جو پیسے بھی کما کر دے اور ان کی غلامی بھی کرے۔ اس لیے سنیتا اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیکن سنیتا کو یہ اچھا نہ لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ انھیں میری نہیں بلکہ ہر ماہ روپیہ لانے والی ایک عورت کی ضرورت ہے، جسے وہ کئی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ بچے بھی پیدا کرے گی۔ گھر بھی سنبھالے گی۔ روپیہ بھی لائے گی۔ پتی کی سیوا بھی کرے گی۔ بعد میں چاہے حالات کے تحت اسے نوکری کرنی پڑتی، لیکن نوکری والی لڑکی تلاش کرنا اسے پسند نہ آیا اور اس نے ساری ہمت بٹور کر ماں کو اس رشتہ کے لیے انکار کر دیا۔ (نگار عظیم، عکس، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1990، ص75)

سنیتا کے اس رشتے سے انکار کرنے کے بعد اس کی ماں اس پر غصہ کرنے لگی۔ باپ اس سے کہنے لگا کہ ساری عمر اسی گھر میں بیٹھی رہو گی کیا؟ بھائیوں نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔ سنیتا کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی گھر کی تین بہنوں نے پھانسی لگا کر اپنی جانیں دے دی ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ سنیتا کو یہ راستہ سب سے آسان اور سیدھا لگا۔ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ پھر اگلے دن وہ اپنی چھوٹی بہن منی کے اسکول اس کی فیس جمع کرنے جا رہی تھی۔ راستے میں ایک سڑک حادثے کو دیکھا، جس میں ایک عورت بری طرح زخمی تھی۔ عورت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ سنیتا نے اسے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹر نے کہا اگر ہسپتال پہنچنے میں تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انھیں برین ہیمبرج ہونے کا خطرہ تھا۔ سنیتا کو لگا اس نے نہ صرف ایک عورت کی جان بچائی ہے بلکہ ایک خاندان کو اجڑنے سے بچایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''..........سنیتا کو لگا اس نے ایک بچہ کو بے ماں ہونے سے

بچالیا ہے۔ ایک بچی کا گھر اجڑنے سے بچالیا ہے۔ اس نے اس عورت کو نئی زندگی دی تھی۔......''

(نگار عظیم، عکس، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1990، ص 75)

اس عورت کی جان بچانے لیے اس کا شوہر بار بار سنیتا کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ خود عورت بھی آنکھوں کے اشاروں سے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ وہ سنیتا کو دیوی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر سنیتا کو اپنا غم بہت چھوٹا لگا۔ اس نے سوچا کیا میں صرف ایک ایسے پتی کے لیے ہی زندہ رہنا چاہتی ہوں، جسے میں نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ جینے کے لیے زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس عورت کی نئی زندگی نے سنیتا کو جینے کا پیغام دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جیے گی اور ضرور جیے گی۔ ان کے لیے جن کو اس کی ضرورت ہے۔ اس بات کو سوچتے ہی سنیتا کے اطراف سے اندھیرا چھٹ گیا اور اس کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

اسرار گاندھی کا شمار دور حاضر کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے اکثر افسانوں میں عورتوں سے متعلق مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اسرار گاندھی کا ایک اہم افسانہ ''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' بھی ہے، جس میں انھوں نے دور حاضر کے ایک اہم جنسی مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ موضوع افسانوں میں نیا تو نہیں ہے، لیکن اردو افسانوں میں اسرار گاندھی نے سب سے پہلے اس پر قلم اٹھایا ہے اور بہت خوبصورتی سے اس موضوع کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔

ترنم ریاض دور حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے متعدد افسانوں میں نسائی مسائل کو موضوع بنایا ہے، جس میں سب سے زیادہ شوہر اور بیوی کے رشتے پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ان کے افسانے ''ناخدا'' میں بھی شوہر اور بیوی کے رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کی ہیروئین اپنی پسند سے شادی کرتی ہے، مگر شوہر کچھ دنوں کے بعد بیوی کی فکر کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ دیر رات تک باہر رہنے لگتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی بیوی پریشان رہنے لگتی ہے۔ پریشانی کے سبب اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب اس کی ماں اس کے گھر عارضی طور پر رہنے کے لیے آتی ہے تو ماں کو دیکھ کر اس کے اندر توانائی آجاتی ہے اور وہ اپنے شوہر کے بارے میں سوچتی ہے اور اس پر خود کو بدلنے کا جنون طاری ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کیا ایسے ہی میری زندگی کی ہر خوشی اور تمنا تمھاری خواہشات پر قربان ہوتے ہوئے ختم ہو جائے گی؟ اونچی تعلیم حاصل کرنے کا میرا خواب ادھورا رہ جائے گا؟ کیا شادی کر کے لڑکیوں کا کیریئر ختم ہو جاتا ہے جب کہ مرد دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلا سکتا ہے۔ تو کیا عورت گھر اور کیریئر ساتھ نہیں چلا سکتی۔''

(ترنم ریاض، یہ تنگ زمین، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1998، ص 105-104)

ترنم ریاض نے اس افسانے میں عورت کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس اقتباس میں مجبور عورت سے ہمدردی دکھائی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک عورت بہت سے کام ساتھ ساتھ کر سکتی ہے۔ گھر، بچے، شوہر، کیریئر سب کچھ سنبھال سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی بیوی ہمت جٹا کر اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ ''آج مجھے بہت کام کرنے ہیں جا کر۔ اس لیے آج آپ گھر پر رہیے۔ میں آتی ہوں۔'' اس کی بیوی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پورے طور سے سما جاتا ہے اور ایک مضبوط ارادے سے وہ یہ بات اپنے شوہر سے کہتی ہے۔ شوہر جب یہ دیکھتا ہے کہ بیوی اب خود مختار ہونا چاہتی ہے، اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہے تو اس کا رویہ بھی نرم ہو جاتا ہے۔

عورتوں کے تمام مسائل میں ایک بڑا مسئلہ طلاق کا ہے۔ کہنے کو تو عورت کے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک اس کے شوہر کا گھر، دوسرا اس کے ماں باپ اور بھائیوں کا گھر۔ مگر طلاق شدہ عورتوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ طلاق کے بعد عورت کو اپنے شوہر کے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی اور ماں باپ کے گھر میں بھی اسے جگہ نہیں ملتی۔ مطلقہ عورت کو سماج میں بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسی کو موضوع بنا کر مشرف عالم ذوقی نے افسانہ ''شاہی گلدان'' قلم بند کیا ہے۔

اس افسانے میں ذوقی نے اشرف جہانگیر اور فرحین کی شادی شدہ زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ جہانگیر ایک آفس میں کام کرتا ہے اور فرحین گھر کے کام کاج کو سنبھالتی ہے۔ جہانگیر گھریلو تناؤ اور آفس کی مزید اضافی ذمے داریوں کی وجہ سے تناؤ میں آکر غصے میں اپنی بیوی فرحین کو طلاق دے دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں گھر آیا تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے انکار کر چکا تھا۔ ایک فائل کی تلاش میں فرحین سے میری جھڑپ ہو گئی۔ مجھے نہیں پتہ میں غصے میں کیا کیا بولتا رہا۔ میری آنکھیں لال تھیں۔ لوٹتے ہوئے میں نے شراب کے دو پیگ بھی لے لیے تھے۔ کچھ اس کا بھی اثر تھا۔ میں زور زور سے چلا رہا تھا۔
>
> ''کیوں میری جان کی دشمن بنی ہو تم۔ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ آئی ہیٹ یو۔ میری زندگی کو دوزخ بنا کر رکھ چھوڑا ہے

تم نے۔اور میں پورے ہوش وحواس میں تمھیں...... طلاق دیتا ہوں...... طلاق...... طلاق...... طلاق......"

(مشرف عالم ذوقی، ایک انجانے خوف کی ریہرسل، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2011، ص 46)

جہانگیر کے طلاق کہنے سے جیسے ہوا رک گئی۔فرحین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔آنسو پلکوں سے زار زار گرنے لگے۔اب جہانگیر کو بھی اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔بات اب مولوی تک پہنچ گئی۔کئی مولویوں نے اپنے اپنے طور پر فتویٰ دیا کہ اب تو عدت پوری کرنی ہی ہوگی، لیکن جہانگیر نے کسی کی نہیں سنی۔اس نے گھر میں رکھا ہوا اپنے اسلاف کے سلطان ہونے کی نشانی شاہی گلدان زمین پر پٹخ کر توڑ دیا اور کہنے لگا میں پرانے ریتی رواج کو نہیں مانتا۔

مشرف عالم ذوقی نے اس افسانے میں یہ بتایا ہے کہ عورت کو بھی اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہے اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں مرد سے بہتر فیصلہ کرنا جانتی ہے۔

ابن کنول کا افسانہ "خواب" کا موضوع بھی موجودہ عہد میں ہو رہے نسوانی جنسی زیادتی اور سماج کے گھناؤنے جرائم جیسے مسائل کو پیش کرتا ہے۔عورتیں مردوں کی ہوس پرستی کا کس طرح شکار ہوتی ہیں۔ابن کنول نے اپنے اس افسانے میں ایسے ہی حیوان صفت افراد کی کہانی بیان کی ہے، جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔افسانہ نگار نے کہانی میں سماج کے چار اہم طبقوں اوباش نوجوان، قانون کے محافظ سپاہی، معزز آدمی اور ریش دراز بزرگ کے چہروں سے نقاب ہٹایا ہے۔یہ چاروں مختلف النوع قسم کے افراد جرائم کے ارتکاب میں یکساں نظر آتے ہیں۔ان وارداتوں سے ہماری نئی نسل پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، ابن کنول نے اس افسانہ میں اس کی ایک جھلک پیش کی ہے۔

افسانہ نگار نے سماج کے چار افراد کو چار اہم طبقوں کے نمائندے کے طور پر پیش کیا ہے۔ہر طبقہ اپنے مخصوص اعمال وافعال کی بنا پر اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ہر ایک کی طرز زندگی اور فکری زاویے متعدد مسائل میں مختلف ہیں، مگر جہاں تک عورت کی عزت وآبرو کا مسئلہ ہے، ان افراد کے نظریات عورت کے تئیں یکساں ہو جاتے ہیں۔چنانچہ چاروں طبقہ کے لوگ افسانہ کی ایک نسوانی کردار نجمہ کے ساتھ اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کر کے اسے بے یار ومددگار چھوڑ دیتے ہیں۔افسانہ نگار نے خصوصی طور پر ان تین طبقوں کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے اور ساتھ میں ان اوباش نوجوانوں کو پیش کیا ہے، جنھوں نے کم از کم اپنے چہروں پر شرافت کا نقاب نہیں ڈال رکھا ہے۔نجمہ ان کو دیکھ کر کسی طرح کی امید تو نہیں رکھتی بلکہ انھیں دیکھتے ہی بھاگ کر اپنی عزت بچانے کی کوشش کرتی ہے۔وہ شریف افراد جو سماج اور قانون کے محافظ سپاہی ہیں، سماج کے معزز افراد کہلاتے ہیں اور ریش دراز بزرگ صفت افراد جو مذہبی ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔سماج میں ان کا ایک خاص مرتبہ ومقام رہتا ہے۔

افسانے میں کئی کردار ہیں، مرکزی بھی اور ضمنی بھی۔تخلیق کار نے ان کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔اوباش نوجوان، قانون کے محافظ سپاہی، ریش دراز بزرگ اور معزز آدمی، امراؤ بیگم، حاجی افتخار حسین وغیرہ کا کردار انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں پیش کرتا ہے۔اوباش نوجوان، قانون کے محافظ سپاہی، معزز آدمی اور ریش دراز بزرگ کا کردار منفی رخ پیش کرتا ہے، جو ایک عورت کی عزت وآبرو کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔امراؤ بیگم اور حاجی افتخار حسین کا کردار ایک اچھے اور فکر مند ماں باپ کا کردار ہے جو اپنی بیٹی کے نامعلوم خواب سے پریشان رہتے ہیں۔ان سب سے بڑھ کر نجمہ اور نور محل کا کردار ہے۔کہانی میں انھیں دو کرداروں کو مرکزیت حاصل ہے۔

غزال ضیغم موجودہ دور کی منفرد افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے زیادہ تر افسانے عورتوں کے مسائل پر لکھے ہیں۔افسانہ "نیک پروین" میں ایک ایسی لڑکی کو موضوع بنایا گیا ہے، جو شادی کے بعد اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے، لیکن ظالم اور عیاش شوہر اس سے کبھی خوش نہیں ہوتا۔وہ شوہر کی نظر میں کبھی نیک پروین نہیں بن پاتی۔

اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کنیز فاطمہ عرف شاہین نام کی لڑکی کی شادی ذیشان کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔دونوں شادی کے بندھن میں بندھ تو جاتے ہیں، لیکن کنیز فاطمہ کو کبھی بھی شوہر کی طرف سے پیار ومحبت اور سکون نہیں ملتا۔شوہر کا پیار حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر ممکن کوشش کی۔اپنے کو اس کے من مطابق ڈھالا، امیر زادی ہونے کے باوجود کھانا بنانا سیکھا، اس کے آفس آنے جانے کا پورا خیال رکھا۔یہ سب کر کے بھی وہ ہار گئی۔اس کا شوہر اسے نظر بھر کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔پھر جب بچی پیدا ہوئی تو فاطمہ نے سوچا کہ اب شاید میرا شوہر مجھ سے پیار کرنے لگے، مگر الٹا ذیشان نے فاطمہ سے کہا کہ مجھے ابھی بچے کی ضرورت نہیں تھی۔یہ تمھاری بچی ہے تم ہی اس کی دیکھ بھال کرو۔

کنیز فاطمہ سے اب اور برداشت نہ ہوا اور ایک دن اپنے شوہر سے خوب لڑائی کی مگر وہ خاموشی سے سنتا رہا۔اس پر محلے کی عورتوں نے کنیز فاطمہ کو ہی غلط ٹھہرایا اور اس سے کہا کہ:

"...... عورت کو مرد کی زیادتیوں پر خاموش رہنا چاہیے۔یہی

نیک عورت کا چلن ہے۔اپنے شوہر کی برائی کرنے والی
عورت سماج میں رسوا ہوتی ہے۔شوہر کی نظروں میں گرتی ہے
اور عاقبت میں بھی کوئی جنت کے محل کا دروازہ نہیں کھلتا۔"

(غزال ضیغم،ایک ٹکڑا دھوپ کا،یوا ئیٹیڈ بلاک پرنٹرس،لکھنؤ،2000،ص56)

ایک طرف مرد عورت کو ذہنی کوفت پہنچاتا ہے اور دوسری طرف عورت مرد کی زیادتیوں کو برداشت کرتی ہے۔ پھر بھی محلے کی عورتیں اسے ہی سمجھاتی ہیں کہ جو عورت اپنے شوہر کی نظروں سے گرتی ہے اسے سماج اور خدا دونوں کی نظروں سے گرنا پڑتا ہے۔یہ ساری باتیں سن کر فاطمہ کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔وہ دماغی مریضہ ہو جاتی ہے۔کیوں کہ وہ اپنے شوہر کی بدکاریوں کو برداشت نہیں کر پاتی۔نہ ہی اسے دوسروں کے ساتھ شیئر کر سکتی ہے۔اوپر سے ذیشان اپنی بیوی کو ہدایت کرتا ہے کہ تم نماز پڑھو،روزہ رکھو،اچھی بنو اور خوش رہا کرو۔شوہر کی یہ نصیحتیں سن کر اسے لگا کہ اگر میں ان کے من مطابق ہو جاؤں تو یہ مجھے پیار کرنے لگیں گے۔وہ نیک پروین بننے کی ممکن کوشش کرنے لگی:

"میں نے نیک پروین بننے کی بے حد کوشش کی۔کامیاب بھی
رہی،لیکن وہ ہاتھ سے نکل گیا۔"

(غزال ضیغم،ایک ٹکڑا دھوپ کا،یوا ئیٹیڈ بلاک پرنٹرس،لکھنؤ،2000،ص58)

کنیز فاطمہ اپنے شوہر کا پیار پانے کے لیے "نیک پروین" بننا چاہتی ہے اور وہ بن بھی جاتی ہے،لیکن اپنے شوہر کا پیار حاصل نہیں کر پاتی ہے۔ایک مشرقی عورت اپنے شوہر کو مجازی خدا تصور کرتی ہے اور اپنی زندگی کا ہم سفر،جو اس کے ساتھ ساتھ رہے۔گھر اور گھر والوں کا پورا خیال رکھے۔بیوی اور بچوں کے جذبوں کا خیال رکھے مگر ایسا نہ ہو سکا اور وہ شوہر کی ان حرکتوں کی عادی بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔

غزال ضیغم کا یہ افسانہ مردوں کی بے راہ روی پر قلمبند کیا گیا بہترین افسانہ ہے۔مرد اگر اپنی بیوی کے تئیں وفادار نہیں ہے اور اس پر طرح طرح کے ظلم کرتا ہے تو اس سے شوہر بیوی کے رشتے میں دراڑ پڑتی ہی ہے،ساتھ ہی معاشرے میں برائی بھی پیدا ہوتی ہے۔اس سے یا تو طلاق کی نوبت آجاتی ہے یا پھر رشتہ ناکام ہو جاتا ہے۔اس کے پیچھے گھناؤنی عادتیں ہوتی ہیں،جن سے دونوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، جیسا کہ غزال ضیغم نے افسانہ "نیک پروین" میں دکھایا ہے۔

ان افسانوں کے علاوہ اور بہت سے افسانوں میں عورتوں کے مختلف النوع مسائل کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے،جن میں "سلام بن رزاق کا افسانہ "زندگی افسانہ نہیں"، احمد رشید کا "دوپہر"،شموئل احمد کا

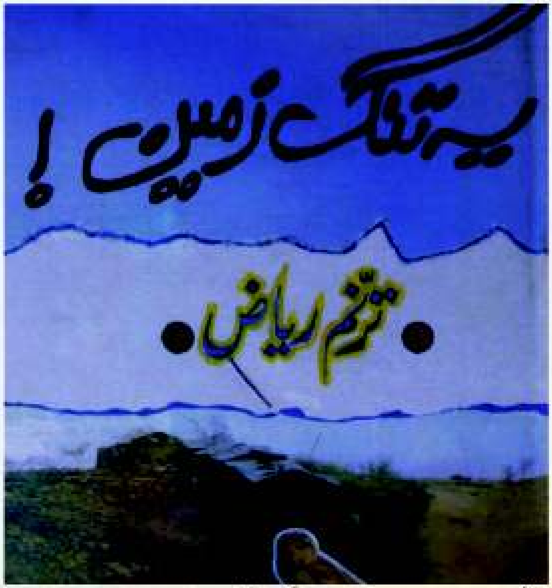

"عنکبوت"، مرزا حامد بیگ کا "جانکی بائی کی عرضی"،قمر جمالی کا "خواب آنکھیں تعبیر"،سید احمد قادری کا "کل کی سیتا آج کی سیتا"،قمر جہاں کا "لہو لہان ہوتی عورت"، صادقہ نواب سحر کا "بے نام سی خلش"، احمد صغیر کا "میں داسی نہیں ہوں"،احمد رشید کا "ایک خوبصورت عورت"،ثروت خان کا "میں مرد مار بھلی"،شائستہ فاخری کا "سنو رقیہ باجی!"،آشا پربھات کا "کفارہ"،غزالہ قمر اعجاز کا "ایک بار پھر"،رینو بہل کا "بات تو سچ ہے" جیسے اور بہت سے افسانے گنائے جا سکتے ہیں۔

الختصر یہ کہ عصر حاضر کے تخلیق کار مرد اور خواتین کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ان افسانوں میں عورتوں کی مظلومیت،جنسی زیادتی،مرد اور عورت کے رشتے میں دراڑ،عورتوں کے جذبات سے کھلواڑ،نیز عورتوں سے متعلق کوئی بھی ایسا مسئلہ باقی نہیں ہے، جس کی عکاسی عصر حاضر کے افسانوں میں نہ کی گئی ہو۔ان افسانوں میں عورتوں کے مسائل کی صرف عکاسی ہی نہیں بلکہ ان کے احتجاج کو بھی موضوع بحث لایا گیا ہے۔

□□□

MD NEHAL AFROZ
Research Scholar
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad-500032 (Telangana)

خلیق النساء

گھرِ کا چراغ

'میڈم ایک صاحب دیر سے بیٹھے ہیں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں'۔ اردل نے اجازت پا کر اندر آتے ہوئے کہا۔

'تم نے کہا نہیں آج میں بزی ہوں۔'

'کئی بار کہا پر وہ کہتے ہیں بہت خاص بات ہے مل کر ہی جاؤں گا۔'

'بھیج دو!' اس نے فائل سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ ابھی ایک ہفتہ قبل ہی تو اس نے یہاں کلکٹر کا چارج لیا تھا اور اس وقت ایک اہم فائل دیکھنے میں منہمک تھی۔

'سلام میڈم'۔ 'والسلام بیٹھیے' نظریں بدستور فائل پر تھیں۔

'کلکٹر صاحبہ میں بہت پریشان ہوں'۔

'کہیے' اس نے نظریں اٹھائیں۔ 'یہ شکل وصورت یہ آواز اجنبی نہیں ہے یا پھر زبردست مشابہت......'

' آپ کا نام؟' 'فیضان صدیقی......' اس کے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا۔

'کہیے کیا پریشانی ہے۔'

'کل پولس نے جن چار جوانوں کو گرفتار کیا ہے ان میں میرا بیٹا بھی ہے اور وہ کسی جرم میں ملوث نہیں ہے۔'

'یعنی پولس نے آپ کے بیٹے کو بے قصور گرفتار کیا ہے۔' 'جی جی......'

'ہونہہ......' کہہ کر اس نے فون اٹھایا، کچھ ہی دیر میں انسپکٹر حاضر تھا۔

'کیا نام ہے آپ کے بیٹے کا؟' 'فراز......'

'اوم پرکاش کل جن چار نوجوانوں کو گرفتار کیا ہے اس کی تفصیل بتاؤ'۔

'جی جوئے کے اڈے سے گرفتار کیا ہے، چاروں نے خوب شراب پی رکھی تھی'۔ اس نے سوالیہ نظروں سے فیضان صدیقی کو دیکھا۔

'میڈم میرے بیٹے نے نہ کبھی شراب پی نہ جوئے کی لت ہے۔'

'پھر وہ جوئے کے اڈے پر کیسے پہنچ گیا؟'

'ہوسکتا ہے اس کے دوست ساتھ لے گئے ہوں۔'

'ان مجرموں میں فراز کے ریکارڈ کے بارے میں بتاؤ'، وہ انسپکٹر سے مخاطب تھی۔

'میڈم اس کے قبضے سے بارہ بور کا ریوالور اور کچھ زیورات بھی برآمد ہوئے ہیں۔'

'صدیقی صاحب......زیوارت کی تو آپ شناخت کر سکتے ہیں انسپکٹر ان کو لے جا کر شناخت کراؤ'، صدیقی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

رابعہ اپنی مردہ بچی کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

'اے ہے کا ہے کی چیخم دھاڑ ہمیں نہیں چاہیے تھی بیٹی اچھا ہوا مر گئی'، وارڈ میں اس کی ساس کی کرخت آواز گونجی۔

'بیٹا ہو یا بیٹی ماں کے لیے تو سب برابر ہیں......' رابعہ کی ماں نے کہا۔

'ہاں ہاں تم یہ بات نہیں کہو گی تو کون کہے گا پانچ بیٹیوں کی اماں جان جو ٹھہریں۔'

'اے بہن......اس میں بحث کیسی یہ سب تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اس نے قرآن میں فرمایا ہے' میں جسے چاہتا ہوں بیٹیاں دیتا ہوں، جسے چاہتا ہوں بیٹے'۔ رابعہ کی والدہ نے کہا۔

'اے بس کرو اپنا وعظ بند کرو ہم بھی مسلمان ہیں'۔ رابعہ کی والدہ نے خاموشی اختیار کرلی۔

اگلے سال وہ پھر امید سے تھی......میڈیکل سائنس کی بدولت جنس کی شناخت ہونے پر لڑکی کو اس کی کوکھ میں قتل کر دیا گیا۔ وہ روئی، تڑپی، چلائی لیکن وہاں سننے والا کون تھا۔ وہ کیا کرے کہاں جائے اس کی سوچیں باغی ہونے لگیں۔ اس نے عزم کیا اب کی بار وہ ان ظالموں کو ایسا ہرگز نہیں کرنے دے گی۔

ایک بار پھر وہ پریگنینٹ تھی۔ ہاسپٹل کی ڈاکٹر اور ہیڈ نرس اس کی جان پہچان کی تھیں اور نرم دل بھی اور پھر سکہ ہر مسئلے کا حل ہے۔ جہیز میں دیے اس کے پاس کافی زیورات تھے۔

الٹراساؤنڈ کی رپورٹ میں لڑکا ہونا ثابت ہوگیا۔ 'اللہ نے میرے بچے کی طرف دیکھ لیا اگر اس بار بھی بیٹی ہوتی تو اس منحوس کو تین طلاق دلوا کر نکالتی'۔ یہ اس کی ساس کے فرمودات تھے۔

وہ لیبر روم میں اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے کانپ رہی تھی۔ باہر

ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس کی ساس اور دیگر گھر والے اس ڈاکٹر سے بری طرح لڑ رہے تھے جس نے بیٹے کی خوشخبری سنائی تھی اور اب اس نے آ کر بیٹی ہونے کی منحوس خبر دی تھی۔

'دیکھیے ماں جی سائنس اللہ کے حکم سے زیادہ نہیں ہے۔ اس وقت ایسا ہی معلوم ہوا تھا یہ تو بھگوان کی لیلا ہے۔' ڈاکٹر اور نرس نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ سمجھنے سمجھانے کی منزل سے آگے تھی۔

رابعہ طلاق کے بعد اس در پہ آ گئی جہاں سے ایک روز دلہن بن کر رخصت ہوئی تھی۔ جہاں ماں تھیں، جاں نثار بھائی تھا اور غم گسار بھابھی جو کزن اور دوست بھی تھیں۔ تینوں نے گلے لگا کر اس کے آنسو خشک کیے۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ اس کا گھر دوبارہ بس جائے لیکن وہ آمادہ نہیں ہوئی اسے شادی اور مرد دونوں کے نام سے نفرت ہو چکی تھی۔ اس کی مکمل توجہ اپنی بیٹی سبرینہ کی تعلیم و تربیت اور مستقبل پر تھی۔ وہ خوددار تھی اپنا اور اپنی بچی کا بوجھ بھائی کے کاندھوں پر ڈالنے کے بجائے اس نے سروس کر لی، حالانکہ بھائی اور بھابھی نے سخت مخالفت کی۔

سبرینہ نہایت ذہین اور صابر بچی تھی۔ اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی تک ٹاپر رہی۔ پروفیسر اس کی ذہانت کے مداح تھے۔ شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی ماں کی بربادی کی داستان جو اس کی پیدائش سے موسوم تھی اسے معلوم ہو چکی تھی۔ البم میں باپ کے فوٹو بھی دیکھے تھے۔ ایک شاپنگ سینٹر میں نانی نے دور کھڑے ایک شخص کی شناخت بھی دی تھی کہ وہ اس کا باپ ہے۔ لیکن کبھی اس کے دل میں باپ کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا۔ آج ماں کی کڑی محنت اور اپنی ہمت اور ذہانت کی بدولت وہ کلکٹر کی سیٹ پر تھی۔

انسپکٹر کے سیلوٹ سے وہ حال میں واپس آ گئی۔

'کیا بنا......!' اعصاب کو قابو کر کے اس نے دریافت کیا......

'میڈم وہ نہایت اوباش لڑکا ہے......'

'زیور کی شناخت؟'

'زیور دیکھ کر وہ چونکیں تو ضرور لیکن پھر انکاری ہو گئے کہ بیٹے کا جرم ثابت نہ ہو لیکن ہم بھی آخر پولس والے ہیں......' 'اچھا سنو......'

'جی......جی میڈم جیسا آپ کا حکم......'

'فیضان صدیقی کو اندر بھیج دو۔' 'جی اچھا......' فیضان صدیقی روبرو تھے۔

'سنیے میرے اختیارات جہاں تک تھے میں نے آپ کے بیٹے کی رہائی کے لیے کہہ دیا ہے۔ لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ شراب بھی پیتا ہے، جوا بھی کھیلتا ہے، جو زیورات برآمد ہوئے وہ یقیناً آپ کی بیوی کے ہیں، پولس کے لیے یہ معلوم کرنا معمولی بات ہے۔ پولس مجرموں کو گرفتار کرتی ہے، سیدھے سادے شہریوں کو نہیں۔'

فیضان صدیقی نظریں نیچے کیے سننے پر مجبور تھے۔

'آپ کے کتنے بچے ہیں؟'

'میڈم فراز میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'

'اوہ تبھی آپ کے بے جا لاڈ پیار نے اس کو اس مقام پر پہنچا دیا۔ ویسے بیٹیاں تو آپ کی ہوں گی......!' فیضان صدیقی خاموش سے ہو گئے۔

'آپ نے جواب نہیں دیا۔'

'میڈم مجھ بدنصیب کا یہی ایک بیٹا ہے......'

'کیا آپ نے کبھی سوچا کہ اگر اس نالائق بیٹے کی جگہ ایک سعادت مند بیٹی ہوتی......!'

فیضان صاحب نے سر جھکا لیا۔

'آپ کی بات مناسب ہے۔ میں ان بدنصیبوں میں ہوں جو گھر آئی دولت کھو کر زندگی بھر پچھتاتے ہیں۔'

'یقیناً ایسے لوگ بدنصیب ہی ہوتے ہیں جو بیٹی کی پیدائش کی وجہ سے بیوی کو زندگی سے نکال دیتے ہیں اور پھر اولاد کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔' اس نے انٹر کام کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

'فیضان صدیقی کو لگا ان کے قریب کوئی طاقتور بم پھٹا ہو۔' تو کیا......؟' 'تو کیا؟' ' ذہن گردان کر رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل چکی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف اس کے پیچھے آئے۔

'ڈرائیور گاڑی کا دروازہ وا کیے اس کا منتظر تھا۔ وہ بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ پشت پر صدیقی صاحب کی آواز سن کر رک گئی۔' بیٹی آپ کا نام......؟'

'سبرینہ فیضان صدیقی آپ کے منہ سے بیٹی کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ جائیے آپ کے گھر کا چراغ پہنچنے والا ہوگا۔ آئندہ احتیاط رکھیے کہ آپ کے گھر اور عزت و ناموس کو اس چراغ سے آگ نہ لگ جائے۔

کہہ کر وہ رکی نہیں، ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی، فیضان صدیقی حسرت سے دور جاتی گاڑی کو دیکھتے رہ گئے۔

□□□

Khaliqun Nisa

Mazar Tate Shah Mian

Rampur-244901(U.P)

ترنم جمال

اپنا عکس

’بیگم صاحبہ‘ خیر الدین مین گیٹ سے ہی چلاتا ہوا ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

’کیا ہوا خیر الدین اس طرح گھبرائے ہوئے کیوں ہو اور تم اکیلے کیوں ہو اسامہ کہاں ہے۔ تم اسے ساتھ لے کر گئے تھے۔ جی بیگم صاحبہ! وہ وہاں شہریار صاحب آ گئے تھے اور زبردستی اسامہ بابا کو گاڑی میں بیٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے بہت منع کیا لیکن وہ نہیں مانے، کہہ رہے تھے شام تک پہنچا دیں گے۔

’خیر الدین تمھیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ تم جانتے ہو شہریار صاحب جب کبھی اسامہ کو لے کر جاتے ہیں تو میری کیا حالت ہو جاتی ہے‘۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بیتابی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ شام کا سایہ گہرا ہوتے ہی میری بیتابی اور بڑھنے لگی۔ تب ہی شہریار کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ شہریار کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح مجھے مایوسی حاصل ہوئی۔ اسامہ اکیلے ہی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈھیر سارے کھلونے اور چاکلیٹس کے پیکٹ تھے اور وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ ’مما دیکھیے پاپا نے مجھے کتنی ساری چیزیں دلائی ہیں۔ پاپا بہت اچھے ہیں مما‘ اور میں اسے بانہوں میں سمیٹ کر سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی غلطی میری ہے۔ آج میرے اور شہریار کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی ذمہ دار میں ہوں۔

اس دن میرا برتھ ڈے تھا۔ شہریار ہمیشہ کی طرح مجھے برتھ ڈے وِش کرنا نہیں بھولے اور شام میں تیار رہنے کے لیے کہا کہ ڈنر باہر ہی کریں گے۔ شہریار کے آفس جانے کے بعد میں گھر کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ اسامہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ شادی کے سات سالوں کے بعد ہمیں اولاد کی خوشی نصیب ہوئی تھی اس لیے دونوں کی جان اسامہ میں اٹکی رہتی۔ شام میں جب شہریار آئے تو میں تیاری کے آخری مرحلے میں تھی۔ میں پنک اور بلیک رنگ کے انارکلی سوٹ میں ملبوس تھی جو شہریار کا فیورٹ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اس کلر میں اور بھی حسین لگتی ہوں۔

انھوں نے مجھے اتنا پیار دیا تھا کہ وقت کی دھوپ مجھے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ شادی کے کئی سالوں کے بعد بھی میں پہلے کی طرح پرکشش تھی۔ انھوں نے مجھے پسندیدہ نظروں سے سراہا۔ میں اسامہ کو گود میں اٹھا کر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ انھوں نے پہلے شاپنگ کرائی پھر ڈنر کے لیے لے گئے۔

واپسی رات کے بارہ بجے ہوئی۔ شہریار کی امی انتظار کر کے سو گئی تھیں۔ صبح اٹھی تو ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ شہریار نے امی سے کہا۔ ’آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کہنا چاہیے تھا۔ ہم لوگ باہر نہیں جاتے‘ امی

نے بہت پیار سے بیٹے کو دیکھا۔ 'نہیں ایسی بھی کچھ بات نہیں بیٹا، اس عمر میں تو یہ سب لگا رہتا ہے۔'

"شہریار مجھے کسی بھی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ فون پر انھوں نے سخت لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ 'تم اس گھر میں قدم نہیں رکھو گی۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔' میرے گھر والوں نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے گھر لے جانے پر رضا مند نہیں ہوئے۔ جوان بیٹی کو اجڑتا دیکھ امی بھی ایک دن خاموشی سے ہم لوگوں کے درمیان سے رخصت ہو گئیں۔ میں اسامہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی"

'پھر بھی امی بتانا چاہیے تھا۔' اور انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا 'زبیدہ تمھیں خیال رکھنا چاہیے تھا امی کا۔'

'سوری شہریار آئندہ خیال رکھوں گی۔' اور اتنے سالوں کے بعد مجھے ایسا احساس ہوا کہ امی دبے لفظوں میں میری شکایت کر رہی ہیں۔ حالانکہ انھوں نے روایتی ساس والا رویہ کبھی نہیں اپنایا تھا۔

میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انھیں اب مجھ سے شکایت رہنے لگی ہے۔ مجھے کبھی بھی امی کے گھر جانا ہوتا تو ٹھیک اسی وقت ان کے سر میں درد ہو جاتا، کچھ نہیں تو ان کی سانسوں کی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا اور ایک روز تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میری چھوٹی بہن جو شوہر کے ساتھ مستقل طور پر یو۔کے سکونت پذیر ہو رہی تھی آج اس کی فلائٹ تھی۔ میں جلد سے جلد گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اس کے یہاں پہنچنا چاہتی تھی۔ تب ہی باتھ روم سے کچھ گرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی امی کی چیخ بھی سنائی دی۔

میں نے جا کر دیکھا تو امی فرش پر گری ہوئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل سہارا دے کر انھیں اٹھایا اور بستر پر لا کر لیٹا دیا۔

شہریار بھی نہیں آئے تھے۔ انھیں اس حالت میں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتی تھی۔ میری بہن اور میرے میکے والے بھی آئے۔ چھوٹی بہن کو گلے لگا کر میں خوب روئی۔ مجھے بے حد ملال تھا کہ جانے کے وقت میں اس سے ٹھیک سے مل بھی نہیں پائی۔

شام کو جب شہریار آئے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور میں نے ساری بھڑاس ان پر نکال دی۔ 'آپ کی امی کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ ایسی نہیں تھیں۔ اب میری خوشی ان سے دیکھی نہیں جاتی۔ میرا میکے جانا تو شاید انھیں بالکل پسند نہیں ہے اور آج تو انھوں نے حد کر دی۔ میں اپنی بہن کو ٹھیک سے سی۔آف بھی نہیں کر سکی۔' میں ان پر زور زور سے چلا رہی تھی۔ میں کہتی جب ان کو گرنا پڑنا ہی لگا رہتا ہے تو ایک جگہ چپ بیٹھی کیوں نہیں رہتی ہیں۔ اچھا ہوتا کہ ان کا ہاتھ پیر ہی ٹوٹ جاتا۔ ہر دن کے عذاب سے جان چھوٹتی۔ شہریار نے بہت زور سے مجھے ڈانٹا اور میں کئی لمحوں تک سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔ میری قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی ہو۔ اس دن کے بعد ہم دونوں کے درمیان اندرونی خلیج پیدا ہو گئی۔ میں ان کے سارے کام تو کر دیتی تھی لیکن ان سے بات نہیں کرتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اسامہ میں گم کر لیا۔ آخر ایک دن شہریار نے ہی پہل کی۔ 'زبیدہ یہ سب کیا ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے امی کا میری زندگی میں کیا مقام ہے۔ میں کافی چھوٹا تھا تب ہی ابو مجھے اور امی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ دوسری شادی کر کے انھوں نے پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔ امی نے تنہا مشقت کر کے مجھے اس قابل بنایا ہے۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم وعدہ کرو آئندہ ان سے محبت سے پیش آؤ گی۔'

میں تو شہریار کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے بھی کہاں یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ فوراً ہی میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

لیکن شومئی قسمت کہیے کہ دوسرے دن میری امی کا فون آیا کہ گھر میں بالکل اکیلی ہوں۔ میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ تم مجھے آ کر ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں نے اسامہ کو گود میں اٹھایا اور یہ سوچے بغیر کہ آج میں امی کو دوا دینا بھول گئی ہوں جبکہ ڈاکٹر کی خاص ہدایت تھی کہ کھانا کھلا کر دوا دینا نہ بھولیں۔

ادھر مجھے امی کے گھر گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک انہونی خبر آ گئی۔ شہریار کی امی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ موت کا وقت اٹل ہے۔ وہ جب آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن ایسا بہانا ہوا جس میں میری لاپرواہی شامل تھی۔ شہریار مجھے کسی بھی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ فون پر انھوں نے سخت لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ 'تم اس گھر میں قدم نہیں رکھو گی، میں تمھاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔'

"میں خاموش ہو گئی۔ مجھے اس سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ مجھے ایسا لگا وہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے اور ایک دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دونوں میرے پاس آئے ۔انھوں نے اتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی یہ سوچے بغیر کہ اس وقت مجھے کتنی اذیت ہوگی۔ جوانی میں شوہر کی بے رخی تو برداشت کر لی یہ سوچ کر کے مجھے بیٹے کے لیے جینا ہے ۔ اس کے سہارے زندگی گزر جائے گی۔ ان دونوں نے بہت آسان لفظوں میں کہہ دیا"

میرے گھر والوں نے انھیں منانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ مجھے گھر لے جانے پر رضا مند نہیں ہوئے۔ جوان بیٹی کو اجڑتا دیکھ امی بھی ایک دن خاموشی سے ہم لوگوں کے درمیان سے رخصت ہوگئیں۔ میں اسامہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

کبھی کبھی شہر یار اسامہ سے باہر ہی مل لیتے تھے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن جب کبھی وہ اسامہ کو اپنے گھر لے جاتے تو مجھے ایک خدشہ لگا رہتا کہ پتہ نہیں وہ اسے واپس لائیں گے بھی یا نہیں۔ اسی شش و پنج میں ایک دن میں اسامہ کو لے کر بنگلور چلی آئی۔ اسامہ کا میں نے جس اسکول میں داخلہ کرایا اسی میں مجھے جاب مل گیا۔ اس اسکول کی پرنسپل شہرینہ بختیار نیک دل خاتون تھیں انھوں نے مجھے ایک کمرہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ یوں میں اسامہ کے ساتھ وہاں رہنے لگی۔

شہرینہ کا بیٹا فاران اور اسامہ ہم عمر تھے۔ دونوں ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوگئے۔ شہرینہ تو فاران کے فرض سے سبکدوش ہوگئی تھی اور وہ اپنی دلہن کے ساتھ امریکہ شفٹ ہوگیا تھا۔ اب مجھے اپنے اسامہ کے لیے دلہن دیکھنا تھی۔ شہرینہ نے اپنی رشتہ دار کی کئی لڑکیوں کی تصویریں دکھائی۔ ایک سے ایک خوبصورت اور ماڈرن تھیں۔ آخر کار شہرینہ کے بڑے بھائی کی لڑکی مہروز مجھے پسند آئی اور یوں مہروز اسامہ کی دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ مہروز ماڈرن خیالات کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ کچھ روز تو وہ نئی نویلی دلہن کی طرح گھر میں رہی لیکن پھر وہ اپنے پاپا کے آفس جانے لگی۔ میری خواہش تھی کہ وہ آفس نہ جایا کرے۔ میں نے دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار اسامہ سے کیا تو اس نے صاف منع کر دیا۔ 'امی اس سے ایسی بات کہیے گا بھی مت۔ آپ تو جانتی ہیں انکل کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ ان کی کمپنی کی ساری باگ ڈور مہروز کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ ان کی تو اب طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی ہے اس لیے گھر بزنس سب اسی کو دیکھنا پڑتا ہے۔'

میں خاموش ہوگئی۔ مجھے اس سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ مجھے ایسا لگا وہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے اور ایک دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دونوں میرے پاس آئے۔ انھوں نے اتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی یہ سوچے بغیر کہ اس وقت مجھے کتنی اذیت ہوگی۔ جوانی میں شوہر کی بے رخی تو برداشت کر لی یہ سوچ کر کے مجھے بیٹے کے لیے جینا ہے۔ اس کے سہارے زندگی گزر جائے گی۔ ان دونوں نے بہت آسان لفظوں میں کہہ دیا۔

'امی وہاں مہروز کے پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلے ہیں۔ ہم لوگ کچھ دنوں میں وہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے پاس روزانہ آتا رہوں۔' مجھے لگا جیسے کانوں میں کھولتا ہوا گرم شیشہ کسی نے ڈال دیا ہو۔

دوسرے ہی ہفتے وہ وہاں شفٹ ہو گئے۔ شہرینہ میرا دکھ سمجھتی تھی۔ اسے بھی ان لوگوں سے ایسی امید نہیں تھی۔

میرا اس شہر سے دل اچاٹ ہوگیا۔ خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ میں نے گھر کی چابی شہرینہ کو پکڑائی اور اپنا مختصر سامان لے کر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ یہ سوچے بغیر کہ میری منزل کہاں ہے۔ صبح سے شام ہوگئی۔ میں پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھی رہی اور اپنے بیٹے کی سنگدلی کے بارے میں سوچتی رہی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اٹھی تو دیکھا میرا سامان غائب ہے جس میں کچھ روپے اور زیورات تھے۔ اب میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا میرے قدم اس طرف چل دیے۔

جی ہاں، اولڈ ایج ہوم۔ جہاں وہ لوگ جاتے ہیں جنھیں ان کے اپنے جگر کے ٹکڑے ایک بوجھ سمجھ کر گھر سے نکال دیتے ہیں یا پھر وہ لوگ جنھیں موت کا انتظار ہو۔

□□□

Tarannum Jamal
26, Zakaria Street
Kolkata-700073 (W.B)

رشتہ

محمد قیوم میو

میں ان دنوں ٹیچر کی نوکری پر نئی نئی مامور ہوئی تھی۔ اس وقت بڑی عجیب کشمکش میں مبتلا تھی لیکن جب سے میں نے نوکری جوائن کی تھی میرا کافی وقت بہ آسانی کٹ جاتا تھا کیونکہ دن بھر میں معصوم اور خوبصورت بچوں کے درمیان گھری رہتی تھی جو ایسی ایسی شرارتیں کرتی کہ میں ان کی حرکتوں سے بڑی محظوظ ہوتی تھی اور میرا کافی وقت پلک جھپکتے ہی گزر جاتا تھا۔ لیکن جب اسکول سے گھر لوٹتی تو تنہائی کا مجھے شدت سے احساس ہوتا۔ گھر جیسے کاٹنے کو دوڑتا۔ گھر کے در و دیوار میری تنہائی پر قہقہے لگاتے اور میں اپنی بے بسی پر محض آنسو بہاتی رہتی۔ ہر وقت میرے کانوں میں میری بیٹی عزیزہ کی آوازیں گونجتی جسے مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔

جس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن قسمت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اور میرے ظالم شوہر نے مجھ سے علاحدگی اختیار کر لی۔ کیونکہ میں اس کی شکل سے بھی نفرت کرنے لگی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے شوہر نے میری بیٹی عزیزہ کو میری ممتا سے محروم کر دیا اور ساتھ ہی میرے ہاتھوں میں طلاق نامہ تھما دیا جس کے لیے میں بالکل آمادہ نہیں تھی۔

شاید قدرت کو یہی منظور تھا اور حالات کی ستم ظریفی بھی یہی تھی۔ میں نے اپنی عزیزہ کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، ساری تدابیر بے سود ثابت ہوئیں۔ میں دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اس وقت میری والدہ ہی میری غم گسار تھیں۔ اگر وہ اس وقت میری حوصلہ افزائی نہیں کرتیں تو میں اندر سے ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی اور میں نے ان ہی کے اصرار پر اسکول میں ٹیچر کی نوکری کی تھی تاکہ میرا گھر کے گھٹن بھرے ماحول سے دل بہلتا رہے اور یہ فیصلہ میرے حق میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ مجھے اس نوکری میں تعینات ہوئے ایک ماہ کا قلیل عرصہ گزر چکا تھا اس کے باوجود مجھے عزیزہ کی جدائی کا شدت سے احساس ہوتا اور میں اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔

میں دوسرے روز اسکول پہنچی تو ہمارے پرنسپل صاحب ایک گوری چٹی بچی کو میرے پاس لے آئے تاکہ اس بچی کو تعلیم دے سکوں۔ جب میں نے اس بچی کو بغور دیکھا تو دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ سامنے میری عزیزہ کی ہو بہو شکل کی بچی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں حیران تھی۔ میرے منہ سے لاشعوری طور پر نکلا 'ارے بیٹی عزیزہ تم یہاں۔'

'اس کا نام عزیزہ نہیں بلکہ پیار سے اسے ٹونی کہتے ہیں۔ ویسے اس کا حقیقی نام گیتا کماری ہے۔' پرنسپل صاحب نے مجھے فوراً ٹوکا۔ میں شرمندہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ میں نے فوراً اس کا نام اپنے رجسٹر پر نوٹ کر لیا اور اسے اپنے پاس بلایا۔ اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اسے بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر میں اس بچی کو گھنٹوں دیکھتی رہی جس کی شکل میری عزیزہ سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ میں اس رات ٹھیک طرح سو بھی نہ سکی۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے رانی کا بھولا بھالا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ وہ رات بڑی کرب و اضطرابی کے عالم میں گزری۔ صبح حسب معمول اسکول کے لیے تیار ہونے لگی۔

میری آنکھیں رات نہ سونے کے سبب سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ امی نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو میں نے ٹال دیا کیونکہ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ میری کمزوری کا علم امی جان کو ہو۔ اسکول پہنچی تو میرا چہرہ رانی کو دیکھ کر شگفتہ پھول کی مانند کھل گیا۔ وہ بے تحاشہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"شاید قدرت کو یہی منظور تھا اور حالات کی ستم ظریفی بھی یہی تھی۔ میں نے اپنی عزیزہ کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ساری تدابیر بے سود ثابت ہوئیں۔ میں دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اس وقت میری والدہ ہی میری غم گسار تھیں۔ اگر وہ اس وقت میری حوصلہ افزائی نہیں کرتیں تو میں اندر سے ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی اور میں نے ان ہی کے اصرار پر اسکول میں ٹیچر کی نوکری کی تھی تاکہ میرا گھر کے گھٹن بھرے ماحول سے دل بہلتا رہے اور یہ فیصلہ میرے حق میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ مجھے اس نوکری میں تعینات ہوئے ایک ماہ کا قلیل عرصہ گزر چکا تھا اس کے بلوجود مجھے عزیزہ کی جدائی کا شدت سے احساس ہوتا اور میں اپنا دل مسوس کر رہ جاتی"

مدتوں بعد مجھے لگا میری عزیزہ کو میں نے اپنے سینے سے لگالیا ہو۔ میں نے اس کے چکنے چکنے گالوں پر پے در پے بوسے دیے اور آغوش میں بھر کر بنچ پر بٹھادیا۔ سب بچے میری اس حرکت پر حیرت زدہ تھے کہ آخر میں صرف رانی پر اتنی توجہ کیوں دیتی ہوں؟ میں بھلا انھیں کیسے بتاتی کہ مجھے عزیزہ کی نعم البدل کی شکل میں رانی ملی ہے جسے میں دل وجان سے چاہتی تھی۔ میں نے رانی کے والدین کو کبھی اسکول آتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ہر روز ایک بوڑھی خاتون لینے اور چھوڑنے آتی تھی۔

مجھے اشتیاق ہوا کہ کیوں نہ رانی کے اہل خانہ سے بھی ملاقات کی جائے تاکہ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو سکے اور پھر ایک روز میں لاشعوری طور پر رانی کے تعاقب میں اس کے گھر تک گئی۔ مجھ پر تو جیسے دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو چلی تھی کسی بھی طرح رانی کو حاصل کرلینا چاہتی تھی۔ جب رانی نے مجھے آتے دیکھا تو اپنے گھر چلنے کی ضد کرنے لگی۔ میں بھلا کہاں انکار کر سکتی تھی۔ گھر پر اس کے والدین موجود تھے۔ رانی نے میرا تعارف اپنے والدین سے کروایا۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ جب میں نے اپنی روداد غم انھیں سنائی تو ان کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں اور انھوں نے مجھے ہر طرح کا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔

دوسرے روز میں رانی کو اپنے گھر لے آئی۔ امی سمجھی کہ ان کی نواسی عزیزہ ان کے رو بہ رو ہے۔ انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ آس پڑوس کے بچے تو اسے سچ مچ ہی عزیزہ سمجھ بیٹھے تھے۔ میں رانی کو پاکر بے حد خوش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا مجھے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ پھر تو وہ ہر روز ہمارے گھر آتی رہتی۔ رانی کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا کہ رانی میرے پاس ہی رہے۔ رانی کے والدین نے ہمیشہ کے لیے رانی کو میری سونی آغوش میں ڈال دیا تھا تاکہ میں اس سے اپنا دل بہلا سکوں۔ جب کہ وہ کافی رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھی۔ اس کے باوجود وہ رانی کو میرے پاس ہی رکھنے پر بضد تھے کیونکہ وہ میری داستانِ غم سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

میں ان کی بڑی احسان مند تھی جو انھوں نے اپنے لخت جگر اور نورِ نظر کو میری جھولی میں ڈال دیا تھا تاکہ میں اپنی ممتا کی پیاس بجھا سکوں۔ میں اللہ رب العزت سے یہی دعائیں کرتی تھی کہ رانی کے جیسے والدین ہر بچے کے ہوں جو دوسروں کے لیے بھی نرم گوشہ رکھتے ہوں۔ ہر ایک کی تکلیف کا انھیں بھی احساس ہو۔

اب میں آہستہ آہستہ اپنی بیٹی عزیزہ کو فراموش کرتی جا رہی ہوں اور میرے دل و دماغ کے پردہ پر رانی کی تصویر ہر وقت گھومتی رہتی ہے۔ اب وہی میری زندگی کا حاصل ہے۔

رانی میرے پاس ہی رہتی ہے۔ اب رانی مجھے ممی ممی کہہ کر پکارتی ہے تو میں خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ ابتدا میں وہ مجھے مس ٹیچر کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ اب تو وہ ممی ممی کہتے نہیں تھکتی۔ میں اسے پاکر بے حد خوش ہوں۔ بہت خوش۔ اللہ کو شاید یہی منظور تھا تبھی تو مجھے عزیزہ کے نعم البدل میں رانی کو دے دیا تھا جو اب میرے لیے سرمایہ حیات سے کم کی حیثیت نہیں رکھتی۔

میں اس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کر رہی ہوں تاکہ کل وہ اس دنیا میں میرا نام روشن کر سکے۔

□□□

Mohd. Qayyum Mew
A/4 Ayyub Manzil, Kareem Nagar
P.O. Taj Ganj
Agra-282001 (U.P)

عرفانہ تزئین شبنم

اوقات

ریانہ اور اماں کی رنجشوں سے تنگ آ کر یا پھر گھبرا کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اماں سے بات کر ہی لیتا ہوں ریانہ کا اصرار بھی روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا تھا اور میں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہا تھا آفس سے تھکا ماندہ گھر آتے ہی میں صوفے پر جوتوں سمیت ڈھے سا گیا اماں سے بات کرنے کی ہمت جٹانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میری اماں تو محبتوں سے گندھی ہوئی تھیں میری مجبوریوں کو مجھ سے زیادہ سمجھ لیتیں حالانکہ بابا نے گھر کی ساری ذمہ داریوں کے علاوہ گھر کے سارے فیصلوں کا حق بھی انھیں عطا کر دیا تھا۔ ریانہ میری زندگی کی اولین چاہت تھی جسے میں نے دیوانہ وار چاہا اور پا بھی لیا اماں نے میری خواہش کو مقدم رکھا۔

"چائے.." ریانہ کی آواز پر میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں بھاپ اڑاتی چائے میرے ہاتھوں میں تھما کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔

"دیکھو زمان......! تم اماں سے بات کرتے ہو یا پھر میں خود کر لوں"۔

"نہیں ریانہ... تم نہیں" میں جلدی سے بولا کیونکہ میں اس کی زبان سے واقف تھا وہ اماں سے جس طرح سے بات کرے گی اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلنے والا تھا۔

" تو پھر جلدی کرو.. میرا یہاں دم گھٹتا ہے" اس کی ممبئی شفٹ ہونے کی خواہش شدید تر ہوتی جا رہی تھی جہاں پتہ نہیں اس کے کون کون سے دوست مقیم تھے۔ میرا بھی خیال تھا کہ وہاں اچھی نوکری مل جائے گی یہاں گاؤں میں رکھا ہی کیا تھا وہاں میرا دیرینہ دوست بھی تھا جو ہمیشہ مجھے ممبئی سیٹل ہو جانے کی پیشکش کرتا رہتا۔

"تم یہاں ایک بار آ کر تو دیکھو زمان" وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا پھر میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ گاؤں چھوڑ کر ممبئی شفٹ ہو جاؤں بات پھر آ کر اماں پر ٹھہر گئی وہ گاؤں چھوڑ کر ہمارے ساتھ آئیں گی یا نہیں یہ بعد کی بات تھی بڑا مسئلہ رہائش کا تھا ممبئی کے فلیٹس تو یوں بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جہاں ریانہ کا اماں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا مشکل تھا میں چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے اماں سے بات کرنے کا سرا ڈھونڈ رہا تھا۔

پردہ سرکا کر میں کمرہ میں داخل ہوا تو اماں تسبیح کے دانے گھما رہی تھیں جونہی ان کی نظر مجھ پر پڑی ان کے صبیح چہرے پر ممتا کی چاندنی بکھر گئی۔

" آؤ بیٹا" ان کا لہجہ محبتوں سے گندھا ہوا تھا میں ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

" کچھ پریشان ہو......" انھوں نے میرے ماتھے پر آئے پسینے کی بوندوں کو اپنے دوپٹے سے صاف کیا۔

" آں.. ہاں اماں.. میرا مطلب نہیں" میں گڑبڑا گیا۔

"چائے پی لی تم نے..؟"

" ہاں اماں ابھی پی کر آیا ہوں... اماں وہ آپ سے کچھ بات کرنی تھی"

"تو پھر جلدی کرو.. میرا یہاں دم گھٹتا ہے" اس کی ممبئی شفٹ ہونے کی خواہش شدید تر ہوتی جا رہی تھی جہاں پتہ نہیں اس کے کون کون سے دوست مقیم تھے۔ میرا بھی خیال تھا کہ وہاں اچھی نوکری مل جائے گی یہاں گاؤں میں رکھا ہی کیا تھا وہاں میرا دیرینہ دوست بھی تھا جو ہمیشہ مجھے ممبئی سیٹل ہوجانے کی پیشکش کرتا رہتا"

" کہو بیٹا"۔

"وہ اماں... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم لوگ ممبئی شفٹ ہو جائیں آپ تو جانتی ہی ہیں نا اماں کہ میں یہاں کچھ بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہا ہوں وہاں شاید کچھ کرلوں آخر انصار بھی تو ہے وہاں پر بس اسی کے اصرار پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے"۔

" اور ریانہ......؟" اماں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"وہ میرے بغیر کہاں رہ سکتی ہے اماں، آپ تو جانتی ہیں" میں کچھ خجل سا ہوگیا۔

" کب جا رہے ہو بیٹا" ان کے لہجہ میں ایک لمبے سفر کی تھکان تھی

" بہت جلد اماں لیکن وہ... "میری ادھوری بات پر استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

" وہاں پر جو فلیٹ ہے میرا مطلب گھر بہت چھوٹا ہے صرف ایک بیڈروم والا تو..." میں آگے نہیں بول پایا اور نظریں چرالیں۔

" ٹھیک ہے بیٹا میں تمھاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں میں یہیں رہوں گی اور پھر یہاں کی مٹی سے الگ بھی تو نہیں ہو سکتی تمھارے پاپا کی یادیں بھی تو لپٹی ہیں یہاں کے در و دیوار سے" وہ خلاؤں میں دیکھتی ہوئی بولیں۔

"لیکن اماں گھر کا پیسہ اٹھا کر ہی تو اس گھر کا بندوبست کرنا پڑے گا آپ تو جانتی ہیں کہ میری تنخواہ کتنی ہے" میری بات پر انھوں نے یکبارگی اپنا جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

" زمان تم"... آگے وہ کچھ نہ کہہ پائیں شاید وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ، میں کہاں رہوں گی۔

" گلستان بہت اچھی جگہ ہے اماں بس کچھ دنوں کی بات ہے جب میں سیٹل ہو جاؤں گا اور اچھی رہائش کا بندوبست کرلوں گا تو فوراً آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

" گلستان "انھوں نے زیر لب کہا ان کی آنکھوں میں ایک سایہ لہرایا۔

" ہاں، ہمارے گاؤں کا سب سے خوبصورت ہوم جہاں بوڑھے لوگ ہی نہیں یتیم ولاوارث بچے بھی رہتے ہیں جس کی وجہ سے بالکل گھر کا ماحول بن جاتا ہے" میں نے اماں کو طفلانہ تسلی دی پر وہ کہیں دور خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ آیا آگے کچھ اور کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ بھی نہیں تھے اور جو کچھ کہنا تھا وہ تو میں نے کہہ دیا تھا۔

ریانہ بہت خوش تھی کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہونے جا رہی تھی اماں تو بہت اچھی تھیں پھر پتہ نہیں کیوں ریانہ کی ان کے ساتھ سرد جنگ ہمیشہ جاری رہتی۔

" اف زمان کتنا اچھا لگے گا جب صرف ہم دونوں ہوں گے اور تیسرا کوئی نہیں ہوگا" اس نے آنکھیں بند کرلیں " یہ خیال ہی کتنا کیف آگیں ہے"۔

" اب بس بھی کرو" میرے لہجے میں اکتاہٹ تھی پتہ نہیں کیوں اماں سے بات کرنے کے بعد دل میں ایک خلش سی تھی مجھے میرے بچپن کے وہ دن یاد آگئے جب دن بھر اماں میرے پیچھے بھاگتی رہتیں میں اپنی من مانیاں کرتا پھرتا اپنی ضد منواتا جب تھوڑا بڑا ہوا تب بھی وہ باتیں جنھیں براہ راست بابا سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی وہ اماں سے کہلواتا اور بابا کی، اماں سے بے پناہ محبت ہی تھی جو وہ ہنس کر اماں کی ہر بات مان لیتے تھے مجھے اس بات کا زعم تھا کہ اماں اور بابا کے پیار کا میں بلا شرکتِ غیرے مالک تھا لیکن اماں کا وہ مان (کہ وہ بھی میری محبتوں کی بلا شرکتِ غیرے مالک تھیں) میں نے اسی دن توڑ دیا جب ریانہ میری زندگی میں آئی۔

موبائل بج رہا تھا سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے میں نے موبائل ریسیو کیا دوسری طرف انصار تھا اس سے بات کرنے کے بعد میں ریانہ کی طرف آگیا۔

" تم نے تیاریاں تو مکمل کرلی ہیں نا؟"

" ہاں سب کچھ تیار ہے بس تم گلستان والوں سے بات کر کے اماں کو چھوڑ آؤ" وہ چہک رہی تھی پھر میں نے اماں سے بھی کہہ دیا کہ دو چار دن میں وہ اپنا سامان باندھ لیں انھیں چھوڑنے کے بعد ہی ہم لوگوں کا جانا ممکن ہوگا ان کا سامان تھا ہی کتنا، ایک ہی بیگ میں آگیا۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے بس اماں کی کچھ دوائیاں لینی تھیں جو اماں کو لے جاتے ہوئے میڈیکل شاپ سے لینا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اماں کا چہرہ

" وہاں پر جو فلیٹ ہے میرا مطلب گھر بہت چھوٹا ہے صرف ایک بیڈروم والا تو ...
" میں آگے نہیں بول پایا اور نظریں چرا لیں۔
" ٹھیک ہے بیٹا میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں میں یہیں رہوں گی اور پھر یہاں کی مٹی سے الگ بھی تو نہیں ہوسکتی تمہارے پاپا کی یادیں بھی تو لپٹی ہیں یہاں کے درودیوار سے " وہ خلاؤں میں دیکھتی ہوئی بولیں۔

" لیکن اماں گھر کا پیسہ اٹھا کر ہی تو اس گھر کا بندوبست کرنا پڑے گا آپ تو جانتی ہیں کہ میری تنخواہ کتنی ہے " میری بات پر انہوں نے یکبارگی اپنا جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

" زمان تم"... آگے وہ کچھ نہ کہہ پائیں شاید وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ، میں کہاں رہوں گی"

ایک دم سپاٹ تھا بس ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی گویا کہہ رہی ہوں " ریانہ تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی تو کیا میں تمھارے بغیر جی پاؤں گی......؟" میں نے نظریں چرالیں راستے میں میڈیکل شاپ سے اماں کی دوائیاں لے کر جیب میں ڈال لیں گلستان کی سربراہ صغرا آنٹی لگ بھگ اماں کی ہم عمر تھیں اندر جانے کے بعد یکبارگی اماں نے مجھے خود سے لپٹا لیا پھر میری پیشانی چومتے ہوئے بولیں" اپنا خیال رکھنا "میں شرمندہ سا ہو گیا یہ تو مجھے کہنا تھا پھر میں نے طفلانہ تسلی دی۔

" میں جلد ہی آکر آپ کو لے جاؤں گا آپ بھی اپنا خیال رکھیں" پھر میں تیزی سے مڑا اور باہر نکل آیا ریانہ کی کال مسلسل آرہی تھی جسے میں اماں کے سامنے ڈسکنیکٹ کرتا رہا اب جیسے ہی ریسیو کیا اس کی تجسس سے بھری آواز آئی۔

" چھوڑ آئے اماں کو۔؟"

"اب اتنی بھی عجلت اچھی نہیں "میں نے جھلا کر کہا پتہ نہیں کیوں دل عجیب سا ہو رہا تھا سگریٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ اماں کی دوا تو جیب میں ہی رہ گئی ہے میں پھر واپس گلستان کی طرف چل پڑا جیسے ہی اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ اماں اندر باغیچے میں بیٹھیں لاوارث بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

" آنٹی...! یہ اماں کی دوائی دینا بھول گیا تھا"

" ٹھیک ہے لاؤ" انھوں نے ہاتھ بڑھایا ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

" کیا بات ہے آنٹی سب ٹھیک تو ہے "میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

" ہاں بیٹے " وہ بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں" تم نے اتنی اپنائیت کے ساتھ پوچھا کہ سوچتی ہوں بتا ہی دوں"

" ضرور" مجھے جلدی جانا تھا بہت سے کام نپٹانے تھے تاہم تجسس نے جانے نہ دیا۔

" برسوں پہلے ایسی ہی بھری دوپہر میں جب میں نئی نئی کام پہ لگی تھی کچھ لوگ ایک بچے کو لے کر آئے وہ اتنا چھوٹا تھا کہ رونے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا لوگوں نے اس بچے کو سڑک کے کنارے پڑے کباڑ سے اٹھایا تھا پتہ نہیں وہ کیسی بے حس عورت تھی جو اپنے معصوم بچے کو کچرے میں پھینک کر گئی تھی۔ میں نے اس کو گلستان میں پناہ دے دی دوسرے ہی دن ایک عورت آئی جو کسی بچے کو گود لینا چاہتی تھی ہم نے اسے سارے بچے دکھائے لیکن اس عورت نے اسی بچے کو چنا جو ایک دن پہلے کباڑ میں ملا تھا۔ اس کے بعد اتفاق ہی تھا کہ اس عورت سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی ہی رہی اس عورت نے اس بچے پر زندگی کی ساری رعنائیاں اور لطافتیں لٹا دیں محبت، اپنائیت، ممتا، گھر سب کچھ... اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا لیکن ."... وہ بولتے بولتے رک گئیں۔

" لیکن کیا آنٹی...؟" میرا تجسس عروج پر تھا۔

..." لیکن آج وہ بچہ اتنا بڑا ہو گیا اس عظیم ماں کو اس لیے گلستان چھوڑ گیا کہ اس کے گھر میں اپنی ماں کے لیے جگہ نہ تھی......" صغرا آنٹی کی بھیگی نگاہیں میرے سراپے پر آکر رک گئیں وہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں ان کا لفظ لفظ مجھے تحت الثریٰ میں اتارتا جا رہا تھا میں وہیں بیٹھتا چلا گیا مجھ میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ دوڑ کر اماں کے پیر ہی پکڑ لیتا۔

□□□

Irfana Tazeen Shabnam
18/368 Hospital Street, Fort
Vaniyambadi-635751(Tamilnadu)

مہنگا اولڈ ایج ہوم

مہوش نور

''ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور میں لان میں بزرگوں کے بیچ بیٹھی خوبصورت موسم اور ان کی باتوں دونوں سے ہی لطف اندوز ہو رہی تھی۔تبھی مجھے دور راہ داری میں ایک بزرگ خاتون لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ لان کی طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی دو تین دن پہلے یہاں آئی ہیں۔آج پھر ایک بیٹا ماں کو بوجھ اور بے کار چیز سمجھ کر خود سے دور تنہائیوں کی نذر کر گیا تھا۔پتا نہیں کیوں وہ خاتون مجھے بہت اچھی لگیں میں اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی اور ان سے باتیں کرنے لگی۔باتوں کے دوران بار بار میری نظریں ان کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں کیونکہ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کشش اور نور تھا''

میں جلدی جلدی آفس کے کام سمیٹ رہی تھی کیونکہ مجھے اپنی دادی ماں سے ملنے اولڈ ایج ہوم جانا تھا۔ان کی آج سالگرہ تھی اور مجھے دیر ہو رہی تھی۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ دادی اور اولڈ ایج ہوم؟؟؟

دراصل بات یہ ہے کہ مجھے اولڈ ایج ہوم کا دورہ کرنا، وہاں بڑے بزرگوں کے درمیان وقت گزارنا، ان سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے، اس لیے میں جب بھی فری ہوتی ہوں، اولڈ ایج ہوم کا چکر لگا لیتی ہوں۔ پہلے تو جب فرصت ملتی تھی تب جاتی تھی لیکن جب سے دادی ماں سے ملی ان سے عجیب سی انسیت ہو گئی تب سے میں روز جایا کرتی ہوں، ان سے ڈھیر ساری باتیں کرنے۔

دادی سے میری ملاقات ایسے ہی ایک دن ہوئی جب میں اولڈ ایج ہوم گئی تھی۔ شام کا وقت، بہار کا موسم، ہر طرف کالے اور گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور میں لان میں بزرگوں کے بیچ بیٹھی خوبصورت موسم اور ان کی باتوں دونوں سے ہی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تبھی مجھے دور راہ داری میں ایک بزرگ خاتون لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ لان کی طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی دو تین دن پہلے یہاں آئی ہیں۔ آج پھر ایک بیٹا ماں کو بوجھ اور بے کار چیز سمجھ کر خود سے دور تنہائیوں کی نذر کر گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ خاتون مجھے بہت اچھی لگیں میں اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی اور ان سے باتیں کرنے لگی۔ باتوں کے دوران بار بار میری نظریں ان کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں کیونکہ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کشش اور نور تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوا کہ وہ اپنی جوانی میں خوبصورت رہی ہوں گی۔ بات کرنے کے انداز، لباس اور سلیقے سے بندھی ہوئی ساڑی اس بات کی غماز تھی کہ وہ خاتون کسی رئیس اور تعلیمی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا۔ سب سے ہنس کر باتیں کرتی تھیں۔ زندہ دلی تو جیسے ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن اس ہنسی اور زندہ دلی کے پس پشت مجھے غموں، دکھوں اور رنج والم کا ایک دریا بہتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہنستی ضرور تھیں ہونٹ تو ساتھ دیتے پر آنکھیں ویران رہتیں ان میں نہ کوئی چمک نہ کوئی خوشی جھلکتی۔ مزاحیہ باتیں تو کرتیں لیکن محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کسی غم میں مبتلا ہیں۔ وہ

صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے یہ سب کر رہی ہیں کہ میں اندر سے بھی خوش ہوں۔ بظاہر خوشی کا چولا پہننے والی یہ عورت اندر سے بہت غمگین نظر آئی مجھے۔ کئی بار دل میں یہ خیال آیا کہ ان سے ان کے غموں کے بارے میں پوچھوں کہ وہ کون سا دکھ ہے جو آپ کو نہ کھل کر ہنسنے دیتا ہے اور نہ ہی جینے دیتا ہے؟ لیکن پھر یہ سوچ کر اپنی زبان کو قابو میں کر لیتی تھی کہ پرانے زخموں کو کرید کر انھیں تکلیف کیوں پہنچاؤں۔ یہی سب سوچ کر میں نے ان سے کوئی بھی سوال نہیں کیا۔ کئی سال ہو گئے دادی سے ملتے ہوئے۔ ان کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ پہلے سے اور بوڑھی اور بیمار نظر آ رہی تھیں۔ چہرے کی کشش اب ماند پڑنے لگی تھی ان کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے ہمت کر کے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کئی سالوں سے میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

"دادی جان آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو بیٹا! میں تیری بات نہیں سنوں گی تو کس کی سنوں گی تو تو میری بیٹی ہے۔"

دادی نے کہا۔

"دادی کون سا ایسا غم ہے جو آپ کو دن رات کھائے جا رہا ہے؟ یہاں اولڈ ایج ہوم میں کوئی اپنی مرضی سے نہیں آتا، کیا آپ کو گھر کی یاد آتی ہے، اس وجہ سے پریشان رہتی ہیں؟"۔

میں نے ہمت کر کے وہ بات پوچھ ہی لی جو میں ان سے نہیں کہہ پا رہی تھی۔ میں ان کے زخموں کو ہرا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن سوچا شاید میں ان کی کچھ مدد کر سکوں، ان کو ان کے خاندان سے ملوا سکوں۔

"ہاں بیٹا! مجھے گھر کی بہت یاد آتی ہے، وہاں گزارے ہوئے لمحات آنکھوں کے سامنے گردش کرتے ہیں۔ بیٹے، بہو اور پوتے، پوتیوں کی یاد ستاتی ہے۔" دادی نے بہت ہی درد بھرے لہجے میں خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے دادی سے کہا آپ مجھے اپنے گھر اور اولڈ ایج ہوم تک کے سفر کی روداد بتایئے نا۔ پہلے تو دادی نے انکار کر دیا لیکن میرے اصرار کرنے پر انھوں نے اپنی چھوٹی مگر خوبصورت دنیا کی داستان کچھ یوں سنائی۔

میں اپنی فیملی میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ خوب ناز نخرے اٹھواتی۔ میری ہر خواہش پوری کی جاتی۔ میرے بھائی، بہن بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اسکول یا کالج سے لوٹتے وقت میرے لیے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ضرور لاتے۔ مجھے ان کی واپسی کا بے صبری سے انتظار رہتا جیسے ہی میں ان کو دیکھتی دوڑتے ہوئے ان کے گلے لگ جاتی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو پھیلا کر اپنا تحفہ وصول کرتی۔ پھر میں بھی ان کے ساتھ اسکول جانے لگی، زندگی بہت خوشگوار تھی۔ زندگی یونہی ہنستے کھیلتے گزر رہی تھی۔ میں نے کب شباب کی دہلیز پہ قدم رکھا مجھے پتا ہی نہ چلا۔ پھر میری شادی تمھارے دادا عباس مرزا سے ہو گئی۔ ان کا شمار شہر کے رئیس اور بہت بڑے بزنس مین میں ہوتا تھا۔ تمھارے دادا میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی بھی کسی چیز کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ اس وقت ہم دونوں میاں بیوی کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی جب ہمارے یہاں شہریار نے جنم لیا۔ ہم دونوں کو جیسے زندگی کا مقصد مل گیا تھا۔ ہماری خوشی کی دنیا ہم تین پر محیط تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ شہریار اب کافی سمجھدار ہو گیا تھا اور اب بزنس میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ پھر ایک حادثے نے ہماری زندگی ہی بدل دی، کار ایکسڈنٹ میں تمھارے دادا چل بسے۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو اور شہریار کو سنبھالا۔ کچھ سالوں بعد میں نے شہریار کی نادیہ سے شادی کر دی۔ بیٹے اور بہو بزنس سنبھالنے لگے۔ مجھے آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ بہو اور بیٹے کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں۔ پہلے کی طرح اب وہ بات نہیں کرتے۔ میں نے کتنی بار پوچھا بھی پر کوئی جواب نہیں ملا۔ کافی دنوں کے بعد ایک دن شہریار میرے کمرے میں آیا تو میں خوش ہو گئی لیکن یہ خوشی چند منٹ کی ہی تھی۔ کیونکہ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ماں میں اور نادیہ تو پورا دن آفس میں ہوتے ہیں۔ ہم دونوں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ آپ کو وقت نہیں دے پاتے اور نہ ہی آپ کی خدمت کر پاتے ہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو اولڈ ایج ہوم شفٹ کر دیں گے، جہاں آپ کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو جائے گی۔ میں اسے بار بار کہتی رہی کہ مجھے یہاں کوئی کمی نہیں ہے، میں خوش ہوں، تم لوگوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں، میرے منع کرنے پر بھی وہ بار بار اصرار کرتا رہا۔ پھر میں خاموش ہو گئی اور "ہاں" کر دی۔ ماں جو ٹھہری، بچوں کے دل کا راز تک بن کچھ کہے ہی جان لیتی ہے۔ میں سمجھ گئی تھی بات کچھ اور ہے وہ دونوں اب مجھے بوجھ سمجھنے لگے تھے، اپنی خوشیوں میں رکاوٹ سمجھنے لگے تھے۔ اس لیے میں نے مسکرا کر کہا کہ ٹھیک ہے۔ جس میں تم خوش رہو۔ میں جانے کو تیار ہوں۔ وہ بہت خوش ہو کر میرے کمرے سے گیا۔ مگر اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کے آنے سے جن آنکھوں میں رونق آ گئی تھی، ہونٹ مسکرا اٹھے تھے، چہرہ کھل اٹھا تھا، جینے کی پھر سے چاہت جاگ اٹھی تھی، ایک ماں کو اپنی اولاد کو سینے سے لگا کر ڈھیر سارا پیار کرنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اب وہاں صرف

"اولڈ ایج ہوم پہنچتے ہی میں نے دادی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی. کمرے کا دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے دادی بستر پر لیٹی ہوئی ہیں, آنکھیں دروازے کو تک رہی ہیں اور ایک ہاتھ میں فون ہے .ایسا لگ رہا تھا جیسے انھوں نے پوری رات فون کا انتظار کرتے اور نمبر ملاتے ہوئے گزار دی ہو.میں دوڑ کے ان کے پاس گئی اور ان کے بے حس و حرکت پڑے جسم کو ہلایا تو ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی"

بے رونق اور ویران آنکھیں، تنہا اور کھوکھلا انسانی جسم پڑا ہوا تھا۔تب سے بیٹے کا انتظار کر رہی ہوں۔ بہت مصروف ہو گیا ہے وہ۔روز ملنے کا وعدہ کرتا ہے اور آنا ہی بھول جاتا ہے۔مصروف اتنا ہے کہ ماں کی خیریت بھی نہیں پوچھتا۔جب بھی میں فون کرتی ہوں بس اس کا ایک ہی جملہ سننے کو ملتا ہے کہ "ماں میں ایک بہت ضروری میٹنگ میں ہوں، ابھی مصروف ہوں، بعد میں فون کرتا ہوں۔" اور رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔کچھ مہینے پہلے شہریار کا فون آیا تھا بتا رہا تھا کہ وہ لندن شفٹ ہو گیا ہے اپنی فیملی کے ساتھ اور کہا کہ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔بس بیٹا تب سے لے کر آج تک دو تین بار ہی اس کا فون آیا۔پر میں ماں ہوں اس کی، مجھے ہر وقت اس کی فکر رہتی ہے۔اس لیے ہر رات میں فون کے پاس بیٹھ کر انتظار کرتی ہوں نہ جانے کب فون آجائے۔لگتا ہے میرے بیٹے کو میری یاد نہیں آتی۔کبھی کبھی جب دل نہیں مانتا تو خود ہی فون کر لیتی ہوں لیکن بات نہیں ہو پاتی۔بہت مصروف ہوں ابھی بعد میں بات کرتا ہوں۔یہ کہہ کر میری بات سنے بغیر ہی فون رکھ دیتا ہے۔یہی کہانی ہے میری زندگی کی۔

دادی ماں کی زندگی کی کہانی سن کر میں نے کتنی ہی راتیں خود سے سوال کرتے ہوئے گزار دیں کہ کوئی اولاد اپنے ماں باپ کے تعلق سے اتنی لاپرواہ کیسے ہو سکتی ہے۔ایسے لوگوں کے دلوں میں اتنا سکون کہاں سے آتا ہے۔بغیر ماں باپ سے بات کیے ان کا دن کیسے گزر جاتا ہے۔ماں باپ کی خیریت پوچھے بغیر نیند کیسے آجاتی ہے۔کیا دولت کا نشہ اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی باہر کی زندگی اتنی پرکشش ہے جو ماں جیسی عظیم ہستی کو اور اپنے خون کے رشتے کی اہمیت کو کھو دیتی ہے۔

آج میں اپنی پیاری دادی ماں کی سالگرہ منانے کے لیے ان کے پاس آئی ہوں۔ہم سب نے مل کر بہت مستی کی۔دادی آج پھر اپنے بیٹے کو فون لگا رہی تھیں۔اس خوشی کے موقع پر وہ اپنے بیٹے سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔آج بھی وہی بہانہ 'مصروف ہوں' 'بعد میں بات کرتا ہوں۔' ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔بڑھاپے اور بیٹے کی لاپرواہی نے انھیں مزید کمزور اور بیمار بنا دیا تھا۔آج وہ بہت بے چینی و بے قراری سے بیٹے کے بات کرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔لیکن ان کے لائق و فائق مصروف بیٹے نے فون نہیں کیا اور میں ان سے صبح ملنے کا وعدہ کر کے آ گئی۔صبح میں جلدی اٹھ گئی اور دادی کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگی۔نہ جانے آج کیوں عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔اولڈ ایج ہوم پہنچتے ہی میں نے دادی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔کمرے کا دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے دادی بستر پر لیٹی ہوئی ہیں، آنکھیں دروازے کو تک رہی ہیں اور ایک ہاتھ میں فون ہے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے انھوں نے پوری رات فون کا انتظار کرتے اور نمبر ملاتے ہوئے گزار دی ہو۔میں دوڑ کے ان کے پاس گئی اور ان کے بے حس و حرکت پڑے جسم کو ہلایا تو ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ایک ماں کی آنکھیں اپنے بیٹے کا انتظار کرتے کرتے، دروازے کو تکتے تکتے پتھرا گئیں، ان کے کان ترس گئے بیٹے کی آواز سننے کے لیے، پر بیٹا اپنی دنیا میں مست اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے سر پر جو مہربان اور دعاؤں کا سایہ تھا، جس سائے نے اسے کامیابی عطا کی تھی، جس سائے نے اسے زمانے کے سرگرم حالات سے بچایا تھا وہ اس سے محروم ہو چکا ہے۔

میری انگلیاں بے ساختہ موبائل کے کی بورڈ پر شہریار کا نمبر ڈائل کرنے لگیں، فون ریسیو ہوتے ہی میں نے بولنا شروع کر دیا۔

"آپ کی ماں انتقال کر گئیں، پلیز آپ ان کی تدفین کے لیے انڈیا آجائیں۔۔۔"

"جی۔۔۔ میں نے ماں کو انڈیا کے سب سے اچھے اور مہنگے اولڈ ایج ہوم میں رکھا تھا، اس لیے ان کی آخری رسومات بھی اچھی طرح ادا ہوں گی۔"

شہریار کی زبان سے ادا ہونے والے یہ جملے جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکرائے میں سن ہو گئی اور وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

□□□

Mahwash Noor
Room No: 148 , Shipra Hostel
JNU, New Delhi-110067

رام داس

اردو

اِک ذاتِ جاوِداں ہے تو
ہر وقت نوجواں ہے تو
ہر دل کی ترجماں ہے تو
شعر و سخن کی جاں ہے تو
دمسازِ دوستاں ہے تو
ہمرازِ عاشقاں ہے تو
تجھ میں رموزِ ہستی ہے
قدرت کی رازداں ہے تو
ہے شرق و غرب میں یکساں
ہر سمت نغمہ خواں ہے تو
سب تیری گود میں کھیلیں
ہر اِک زبان کی ماں ہے تو
تجھ سے صدف کی قیمت ہے
ابرِ گہر فشاں ہے تو
ہر شعبۂ ادب میں ہے
عالم پہ حکمراں ہے تو

سب تجھ سے فیض پاتے ہیں
اردو، جہاں، جہاں ہے تو
ساری زبانوں سے اچھی
بھارت کی اِک زباں ہے تو
اقبال کی زباں ہے تو
غالب پہ مہرباں ہے تو
استاد داغ کہتے تھے
سب سے بھلی زباں ہے تو
تو، ہے فراقؔ کا پرچم
اقبال کا نشاں ہے تو
دے کر مکان ہندی کو
کیوں آج بے مکاں ہے تو؟
سہتی ہے سب کے ظلم و ستم
اے اردو، سخت جاں ہے تو
یہ رام داس کہتا ہے
میر و جگر کی جاں ہے تو

Prof.(Dr.) Ramdas
Khadija Nursing Home
Ranchi Pahadi, Imambara Road
Ranchi-834001 (Jharkhand)

نظمیں

محمودہ خانم

اے زندگی

تجھے لگتا ہے اے زندگی
تو سنورتی جا رہی ہے
تجھے سنوارنے کے لیے
میں نے کیا کیا گنوا دیا
جو پہلے سے بنی ہوئی تھی
اس کو پھر کیا بدلنا
بدلا جو ہم نے تجھ کو
تو سب کچھ گنوا دیا
خوشی میں تھی پرنم آنکھیں
غم میں جھلکتی خوشیاں
کیسے بتاؤں تجھے میں
میں نے کیا کیا فنا کیا
انسان اگر یہ جانے
یوں بنتے نہیں فسانے
قسمت سے جو ہے ملتا
وہ سب کچھ مٹا دیا
نا تجھ کو سنوار پائی
نا خود کو سنبھال پائی
جیتی گئی ہمیشہ
نا کوئی فیصلہ لیا
بن کر بگڑتی میری یہ زندگی
بگڑ کر گئی ہے بنتے
جو کچھ ملا ہے ہم کو
خدایا! یہ شکر تیرا!

مقدر

مقدر میرا نہ تم بن سکے تو کیا
تمھاری آرزو تو میرے دل میں زندہ ہے
تم سانس جب لو تو محسوس ہو تمھیں
تمھارے لیے کوئی تو تابندہ ہے
تم نے سمجھا نہیں ہمیں اپنا
اس میں نہ میری خطا ہے
تم بے وفا نہیں ہو
میرا دل یہ جانتا ہے
دنیا کی ساری رسمیں اگر میں جانتی
سارے درد ہنس کر میں جھیل جاتی
کچھ بھی نہ تمھیں بتاتی
انکار کی تمھاری اگر
کوئی وجہ میں ہوتی
دل خود ہی سنبھل جاتا
آنکھیں نہ میری روتیں
جو تم نے ہمیں ستایا
وہ نہ اتنی بڑی وجہ ہے
اک تم کو اپنا جانا
باقی سب بے وجہ ہے
ہر درد میں جھیل جاؤں
تم سے نہ کوئی گلا ہے
تمھیں درد کوئی ملے نا
میں نے دل سے کی دعا ہے!

Mahmuda Khanam
Assistant Professor
Dept. of Hindi, Kidderpore College
Kolkata-700023 (W.B)

شیخ صابرالدین نورالدین

عورت

سہہ کر تکلیف بڑی پہلی اسے جنم دیتی ہے
خوشیاں دیتی ہے اسے،غم اپنے حصے لیتی ہے
دوسری اسے زندگی کے کسی موڑ پر ملتی ہے
ساتھ سے اس کے خوشی کی ہر کلی کھلتی ہے
تیسری رب کی مہر سے گھر اس کے ہوتی ہے پیدا
ہزار جان سے جس پر پھر یہ ہوتا ہے شیدا
پہلی اس کے لیے کچھ بھی کر گذرنے کو تیار
اس کی خوشی کی خاطر خود کو کردے نثار
دوسری اس کو ہر گھڑی بہت لگاتی ہے جان
دلجوئی میں اس کی تیار رہتی ہے ہر پل ہر آن
تیسری اسے سکھاتی ہے کس طرح جی لگانا
کیسے خوب پیار کرنا اور پیار سے پیش آنا
پہلی کی تو وہ جیسے جان ہے زندگانی ہے
بنا اس کے ادھوری پہلی کی ہر کہانی ہے
دوسری کے لیے وہ جہاں میں سب سے پیارا ہے
اسی کے لیے تو رب نے جیسے اسے اتارا ہے
تیسری اسے خود کی جان سے زیادہ پیاری ہے
وہ اس کی پری، اس کی شہزادی، اس کی دلاری ہے

پہلی اسے اچھی باتیں، اچھے اخلاق سکھاتی ہے
زندگی کے ہر قدم پر جس کی دعا کام آتی ہے
دوسری دیتی ہے اسے بے پناہ محبت و پیار
مرتے دم تک بھی نہ اترے جس کا نشہ وخمار
تیسری نے اس کے بے قرار من کو دے دیا قرار
جس کے آنے سے اس کی زندگی میں آگئی بہار
چوٹ لگنے پر اس کی زباں پہ پہلی کا نام آئے
نام لینے پر جیسے درد میں بھی راحت مل جائے
اسی چوٹ پر دوسری کی بھی آنکھ بھر آئے
چوٹ لگے اس کو درد دوسری کو ہو جائے
تیسری جب دیکھے چوٹ لگی ہے تو تڑپ جائے
پاس اس کے آکر چوٹ پر اس کی مرہم لگائے
پہلی کا وہ بیٹا ہے، جگر کا ٹکڑا ہے، لعل ہے
بنا اس کے جینا ایک ماں کے لیے تو محال ہے
دوسری کا وہ مجازی خدا، سرتاج ہے شوہر ہے
شوہر کی اطاعت، فرمانبرداری بیوی کا گوہر ہے
تیسری کا ہے وہ باپ، اس کا سائبان ہے
بیٹی کے لیے باپ کی ہر خوشی قربان ہے

Shaikh Sabiruddin Nooruddin
Temburni, Jafrabad
Jalna-431206 (MS)

لذیذ پکوان

ارم نعیم

ہلدی اور میوے کا حلوا

اجزا: 100 گرام بادام، 100 گرام کاجو، 100 گرام اخروٹ، 100 گرام چھوہارے، ایک عدد گری (یہ سارے میوے اچھی طرح کٹے ہوئے ہوں)، 100 گرام تال مکھانے، 50 گرام کشمش، 50 گرام چرونجی، 50 گرام خش خش، 200 گرام بیسن، 250 گرام چینی، 4 چھوٹے چمچ ہلدی، 4 بڑے کپ پانی، 4 بڑے چمچ رفائنڈ یا سرسوں کا تیل، 5 بڑے چمچ دیسی گھی، 150 گرام گوند۔

ترکیب: ایک پین میں ایک چمچ دیسی گھی ڈال کر سارے کٹے ہوئے میوے (بادام، کاجو، چرونجی، گری، اخروٹ، چھوہارے، چرونجی، (خش خش) کو ہلکا براؤن ہونے تک بھون لیں اور کسی برتن میں الگ رکھ لیں۔ اب اسی پین میں ایک چمچ دیسی گھی ڈال کر تال مکھانے اچھی طرح کُرکُرا ہونے تک بھون کر الگ رکھ لیں (تال مکھانوں کے فرائی ہونے پر انھیں خلل یا کسی چیز کی مدد سے ہلکا کوٹ لیں)۔ اب اسی پین میں آدھا چمچ گھی ڈال کر بیسن کو ہلکا براؤن ہونے تک بھونیں اور کسی برتن میں نکال لیں۔ اب دو بڑے چمچے رفائنڈ یا سرسوں کا تیل گرم کر کے اُس میں گوند کے دانے ڈال کر اُسے اُس وقت تک فرائی کریں جب تک یہ تال مکھانے جتنے بڑے نہ ہو جائیں۔ ان کو کسی برتن میں ڈال کر خوب اچھی طرح کوٹ کر الگ رکھیں۔ اب اُسی پین کے بچے ہوئے تیل میں دو چمچے مزید تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں ہلدی اور دو کپ پانی ڈال کر اُس وقت تک ہلدی کو بھونیں جب تک تیل اُوپر نہ آجائے۔ اب اُس میں چینی اور دو کپ پانی ڈال کر اچھی طرح چاشنی تیار کر لیں۔ اب چاشنی میں بُھنا ہوا بیسن، تلے ہوئے میوے اور گوند کو دو چمچے دیسی گھی ڈال کر ان سب کو اچھی طرح ملائیں اور دھیمی آنچ پر اُبال آنے تک پکائیں، اب آپ کا ہلدی اور میوے کا حلوہ بالکل تیار ہے۔ اب آنچ سے اُتار کر گرما گرم یا ٹھنڈا ہونے پر استعمال کریں۔

نوٹ: 1۔ آپ کو سبھی چیزیں دھیمی آنچ پر پکانی ہیں۔

2۔ موسمِ سرما میں یہ غذا جوڑ اور کمر درد کے لیے نہایت مفید و کارآمد ہے اور آپ اسے 15-20 روز تک آسانی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

میونیز سینڈوچ (Mayonnaise Sandwich)

اجزا: پیاز ایک عدد، شملہ مرچ ایک عدد، ٹماٹر ایک عدد، 2/1 کھیرا، 4/1 بند گوبھی، گاجر ایک عدد (ساری سبزیاں باریک کٹی ہوئی ہوں)، 2/1 کپ اُبلے ہوئے فروزن کارن، ایک بڑا چمچ انار کا دانا، ایک چھوٹا چمچ چینی، کالی مرچ پاؤڈر ذائقے کے مطابق، 3 بڑے چمچ میونیز (بازار سے اپنی پسند کے مطابق کسی بھی قسم کی لے سکتے ہیں)، 6 بریڈ سلائسیز، 2-3 چمچ مکھن (فرائی کرنے کے لیے)۔

ترکیب۔ ایک پیالے میں میونیز، پیاز، ٹماٹر، گاجر، بند گوبھی، کھیرا، اُبلے ہوئے کارن، انار، چینی، کالی مرچ پاؤڈر کو اچھی طرح ملا کر پیسٹ بنا

لیں، اب اس کو بریڈ میں اچھی طرح لگا کر اس پر دوسرا بریڈ رکھیں اور ایک پین گرم کر کے اس پر تھوڑا سا مکھن ڈال کر اچھی طرح براؤن ہونے تک دونوں جانب سے فرائی کر لیں، اب اپنی پسند کے مطابق سلائسیز کے ٹکڑے کاٹ کر اسے ٹومیٹو یا چلی ساس کے ساتھ گرما گرم استعمال کریں۔

نوٹ۔ آپ اگر اپنے میونیز کو کلر دینا چاہتے ہیں تو آپ میونیز میں 2 چمچ ٹومیٹو ساس ڈال کر اچھی طرح ملا لیں، اب آپ کا سینڈوچ سفید کی جگہ پیازی رنگ کا بنے گا۔

آپ اپنی پسند کے مطابق براؤن بریڈ کا استعمال کر سکتے ہیں۔

سینڈوچ کا پیسٹ بنانے میں اپنی پسند کی سبزیاں ڈال سکتے ہیں۔

آپ اگر بریڈ کو فرائی کرنا نہیں چاہتے تو آپ ایسے بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

سویٹ کارن(Sweet corn)

اجزا۔250 گرام فروزن کارن (اگر آپ کے پاس بھٹے موجود ہیں تو اس کے دانے بھی استعمال کر سکتے ہیں)، ۲ کپ پانی، نمک ذائقے کے مطابق، لال مرچ پاؤڈر ذائقے کے مطابق، 4/1 چاٹ مصالحہ، کالی مرچ پاؤڈر ذائقے کے مطابق، ایک چمچ لیموں کا رس، 3 چھوٹے چمچ مکھن۔

ترکیب: سب سے پہلے ایک پین میں فروزن کارن اور پانی ڈال کر اسے ڈھک کر 5-6 منٹ تک اچھی طرح اُبال لیں، اب دانوں کے نرم ہو جانے پر انھیں پانی سے الگ کر لیں، اب اسی برتن میں اُبلے ہوئے فروزن کارن میں مکھن، نمک، لال مرچ پاؤڈر، کالی مرچ پاؤڈر، چاٹ مصالحہ اور آخر میں لیموں کا رس ڈال کر 1-2 منٹ تک پکائیں، اس کے بعد آنچ سے اُتار کر گرما گرم اسنیکس کا استعمال کریں۔ چند منٹوں میں بچوں کی پسند کا ریسٹرانٹ جیسا سویٹ کارن تیار ہے۔

نوٹ: بھٹے کا استعمال ہمیں اپنی غذا میں ضرور کرنا چاہئے، کیونکہ اس میں موجود فائبر، وٹامن سی ہمارے جسم سے کیلسٹرال کم کر کے وزن گھٹانے میں مدد کرتا ہے اور زنک، میگنی شیم اور فاسفورس ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے، اسے کھانے سے ایک طرف آنکھوں کی روشنی میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری جانب چہرے پر نکھار پیدا ہوتا ہے۔ گٹھیا کے مرض میں بھی راحت و آرام ملتا ہے۔

چقندر اور گاجر کا جوس

اجزا:2-3 چقندر، 2-3 گاجر، 3 کپ پانی، 1 چھوٹا چمچ چینی، 10-15 پودینے کی پتیاں، آدھا لیموں، نمک ذائقے کے مطابق، کالی مرچ پاؤڈر ذائقے کے مطابق۔

ترکیب: سب سے پہلے چقندر اور گاجر کو اچھی طرح صاف کر کے انھیں چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں، اب ایک جوسر گرائنڈر میں کٹے ہوئے چقندر، گاجر، پودینہ، چینی اور پانی ڈال کر باریک ہونے تک اچھی طرح پیس لیں، اب اسے کسی باریک کپڑے یا چھلنی کی مدد سے چھان کر اس میں لیموں کا رس، نمک اور کالی مرچ ڈال کر تازہ جوس کا استعمال کریں۔ یاد رہے اسے بنا کر زیادہ دیر رکھنا اس کے اصل فوائد سے آپ کو محروم کر سکتا ہے۔

Eram Naim
Dept. of Urdu
Allahabad University
Prayagraj-211002(U.P)

ڈاکٹر احسان رؤف

سروائیکل کینسر

رحم (Uterus) کا ایک اہم کینسر

سروائکل کینسر (Cervical Cancer) ایک طرح کا آہستہ آہستہ شروع ہونے والا کینسر ہے جو کہ رحم (Uterus) کے نچلے حصہ Cervix میں شروع ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر ایک سال میں تقریباً سروائکل کینسر کے آدھا ملین مریض ہوتے ہیں جس میں 85% مریض low اور Middle income ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستانی خواتین میں یہ دوسرا سب سے عام کینسر ہے جس کے تقریباً ہر سال میں 122,844 نئے مریض کی تشخیص ہوتی ہے، جبکہ ہر ےویں منٹ میں ایک عورت کی سروائکل کینسر کی وجہ سے موت ہوتی ہے جس میں ہر چوتھی عورت ہندوستانی ہوتی ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کینسر ہندوستان میں کافی عام ہے اس کے علاوہ اس کینسر کی شرح اموات بھی کافی زیادہ ہے۔

اسباب (Causes)

رحم (uterus) کی سروکس (Cervix) کے high risk قسم کے Human Papilloma Virus (HPV) کا تعدیہ (infection) سروائکل کینسر کا اہم سبب ہوتا ہے۔ جبکہ صرف اس وائرس کا واحد تعدیہ سروائکل کینسر کا سبب نہیں بنتا ہے اس کے علاوہ کچھ معاون اسباب بھی سروائکل کینسر کے ہونے کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ HPV کے تقریباً 100 سے زائد اقسام ہوتے ہیں۔ HPV کے 16 اور 18 قسم تقریباً 70 فیصد سروائکل کینسر کا سبب ہوتے ہیں۔ HPV ایک Sexually Transmitted virus ہے، اس کے علاوہ سروائکل کینسر کے معاون اسباب میں ایک سے زیادہ مرد کے ساتھ مباشرت کرنا، جنسی اعضا (Genital organs) میں تعدیہ (infection) ہونا، سگریٹ نوشی، Low socioeconomic status وغیرہ اہم ہیں۔

علامات (Symptoms)

سروائکل کینسر عام طور پر ادھیڑ عمر (midlife) میں پایا جاتا ہے۔ آدھی عورتوں کی تشخیص (Diagnosis) 35 اور 55 سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ یہ 20 سال سے کم عمر میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ تقریباً 20 فیصد عورتوں میں یہ مرض 65 سال سے زیادہ کی عمر میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں کو پابندی کے ساتھ Cervical cancer کی جانچ کراتے رہنا چاہیے۔

سروائکل کینسر کی ابتدائی حالت میں عام طور پر علامات ظاہر نہیں ہوتی ہیں اسی وجہ سے PAP اور HPV کی جانچ کے ذریعہ کینسر سے پہلے کے حالات (Precancerous stage) کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کو بڑھنے سے روکا بھی جاسکتا ہے۔ سروائکل کینسر میں مندرجہ ذیل علامات پائی جاتی ہیں:

- غیر طبعی حیض (Abnormal Menses) کا ہونا
- مباشرت کے بعد Bleeding کا ہونا
- Pelvic exam کے بعد bleeding کا ہونا
- سن یاس (Menopause) کے بعد bleeding کا ہونا
- پیٹ کے نچلے حصہ میں درد ہونا جس کا تعلق حیض سے نہ ہو
- پیشاب کا بار بار ہونا
- پیشاب کرنے میں درد ہونا
- مہبل (Vagina) سے زیادہ مقدار میں بدبودار Discharge ہونا۔

تشخیص (Diagnosis)

PAPاور HPV کی Screening کرکے سروائکل کینسر کی ابتدائی حالت کومعلوم کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد Biopsy کے ذریعہ سروائکل کینسر کی تشخیص ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ Ultrasonography CT Scanاور Hysterosalpingography بھی سروائکل کینسر کی تشخیص میں معاون ہوتے ہیں۔

علاج (Treatment)

جب سروائکل کینسر کی تشخیص ہوجائے تو مریض کو ماہر امراض نسواں و سرطان(Gynaecologic oncologist) سے رجوع کرنا چاہیے۔سروائکل کینسر کا علاج جراحت (Surgery)، Radiotherapy اور Chemotherapy کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ سروائکل کینسر کی شروعاتی حالت میں جراحت کے ذریعہ علاج ہوتا ہے۔ جب کینسر پوری طرح سے ہوجاتا ہے اس صورت میں Chemotherapy اور Radiotherapy کے ذریعہ علاج ہوتا ہے۔

انجام مرض(Prognosis)

جب کینسر کی تشخیص جلدی ہوجاتی ہے تو Invasive cervical cancer کے 91 فیصد مریض 5 سال تک ہی جی پاتے ہیں جبکہ اگر سروائکل کینسر رحم کے پاس کے اعضا(organs) اور انسجہ (tissues) میں پھیل جائے اور Regional lymph nodes میں بھی پھیل جائے تو تقریباً ۵ فیصد مریض ہی ۵ سال تک جی پاتے ہیں۔

تحفظ(Prevention)

مندرجہ ذیل طریقوں کو اپنا کر سروائکل کینسر کے ہونے کے امکانات کو کم کیا جاسکتا ہے

Vaccination

HPV کے مقابل میں Vaccination سروائکل کینسر کے تحفظ میں اہم طریقہ ہے۔ یہ Vaccine عام طور پر 9 سے 26 سال کی عمر میں لگائی جاتی ہے۔

Pap Test

اس ٹسٹ کے ذریعہ کینسر سے پہلے کی حالت (Precancerous stage) کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اکثر طبی ادارے 21 سال کی عمر میں اس ٹسٹ کو کرانے کی صلاح دیتے ہیں اور ہر 3 سال کے وقفہ پر یہ ٹسٹ کراتے رہیں۔

ایک سے زائد مردوں سے مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سگریٹ نوشی(Cigarette Smoking) سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

خلاصہ (Conclusion)

سروائکل کینسر کا تحفظ اور علاج کیا جاسکتا ہے۔Vaccination اور جلدی تشخیص کرکے اور وقت پر علاج کرکے کافی حد تک سروائکل کینسر کو قابو میں کیا جاسکتا ہے۔

Dr. Ehsan Rauf

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki, Sitapur Road

Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

پھٹے اور خشک ہونٹ کو خوبصورت بنانے کا طریقہ

پھٹے ہوئے ہونٹ خشک ہوں اور ان میں درد اور اُن سے خون بھی نکلتا ہو تو ان مسائل سے نجات کے لیے دو قطرے کیمومائل آئل اور دو چائے کے چمچ ایلوویرا جیل مکس کرلیں اور دن میں دو سے تین دفعہ ہونٹوں پر لگائیں۔

مہندی سے بالوں کو مضبوط اور خوبصورت بنانے کا طریقہ

اگر مہندی سر پر لگانا چاہتے ہیں تو پہلے تمام مہندی کو پانی میں حل کرلیں۔ اب ایک کھانے کا چمچ چینی، ایک انڈہ اور ایک کھانے کا چمچ کلونجی شامل کر کے تین چار گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ مہندی کو بالوں میں لگانے سے قبل دو قطرے لیموں کے رس کے بالوں میں لگائیں اس کے بعد مہندی لگائیں۔ اس سے بال مضبوط اور خوبصورت ہو جائیں گے۔

اسٹیم سے کریں چہرے کے داغ دھبوں کا خاتمہ

بھاپ لینے کے لیے ایک پیالے میں کھولتا ہوا پانی ڈالیں۔ اپنے سر کو تولیہ سے ڈھک کر اپنا چہرہ پانی کے پیالے سے ایک فٹ اونچا رکھیے تا کہ بھاپ نکلنے نہ پائے دو یا تین منٹ کے بعد تولیہ ہٹا لیجیے۔ اس کے بعد

اپنے چہرے کو گرم پانی سے دھولیں اور اسے تھپکنے کے انداز میں خشک کرلیں۔ کلینزنگ کا یہ عمل چہرے کے داغ دھبوں اور دانوں کو دبا کر ختم کرنے کی خواہش سے گریز کرے گا۔ اگر آپ ایسا کریں گی تو یہ انفیکشن مزید آپ کی جلد کی گہرائی میں اتر جائے گا اور اسے درست ہونے میں دوگنا وقت لگ جائے گا۔

خشک اور کمزور بالوں کو ٹھیک کرنے کا زبردست فارمولا

خشک اور کمزور بالوں کا مسئلہ خواتین اور مردوں دونوں میں ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے آپ مختلف قسم کے کیمیکل استعمال کرتے ہیں جو آپ کے بالوں کو کمزور کرتے ہیں۔ درج ذیل میں نسخہ بتایا جارہا ہے، جس پر عمل کرکے آپ بالوں کے مسائل سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں۔

سوکھا ریٹھا، آملہ اور سیکا کائی ان تمام اجزا کو رات بھر کے لیے پانی میں ڈال کر رکھ دیں۔ صبح اس کو ہلکی آنچ پر آدھے گھنٹے تک اُبال لیں جب گاڑھا ہونے لگے تو liquid بچا ہوا الگ کرلیں۔ اب تھوڑے سے مکسچر کو لے کر اتنا مسلیں کہ وہ گاڑھا ہوجائے۔ اب اس میں ایک چمچ ٹی ٹری آئل اور سات سے آٹھ قطرے سفیدے کا تیل شامل کرلیں۔ اس مکسچر کو بالوں پر لگائیں، ہفتے میں دوبار استعمال کریں۔

دہی سے چہرہ نرم اور چمکدار بنانے کا طریقہ

تھوڑا سا دہی لے کر اس میں 4 قطرے سفید سرکہ کے شامل کریں

اور اس کا مساج چہرے پر کریں۔ اس کے بعد چہرے کو پانی سے دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو تین بار کرنے سے آپ کا چہرہ چمکدار ہوجائے گا۔ آپ صرف دو ہفتے میں واضح فرق محسوس کریں گی۔

مصروف ہونے کی وجہ سے ہاتھوں کی خوبصورتی کا خیال نہیں رکھ پاتے تو یہ آسان طریقہ شروع کردیں

روزانہ گھر کے مختلف کاموں میں ہاتھوں کی دیکھ بھال کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس لیے اکثر ہاتھ بہت سی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں جیسے کہ ہاتھوں کا پھٹنا، سخت ہوجانا وغیرہ۔

اس کے لیے آسان طریقہ ہے کہ آپ زیتون کا تیل اپنے ہاتھوں پر لگا کر مساج کریں اور اس کے علاوہ ناریل کا تیل اور سرسوں کا تیل بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

شہد اور لیموں کا جوس ہم وزن ملا کر ہاتھوں کی مالش کرنے سے بھی ہاتھ نرم اور خوبصورت ہوجاتے ہیں۔

زیتون سے بھنوں کو گھنا کرنے کا نسخہ

بھنوں کو گھنا کرنے کے لیے زیتون کا تیل لے کر تنکے کے ساتھ روئی سے لگائیں اور یہ عمل رات کو سونے سے پہلے کریں۔ اس عمل سے آپ کی بھنویں گھنی اور اچھی ہوجائیں گی۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

تاثرات: نگر نگر سے

کسی بھی معاشرے کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، سماجی اور معاشی استحکام کے لیے مردوں کے ساتھ خواتین کی برابر کی حصہ داری کا بڑا دخل ہے۔ یہ تاریخی غلطی ہے کہ اسے عہد جدید کا تقاضہ سمجھ کر اس کی وکالت کی جاتی ہے حالانکہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی ابتدا سے ہی خواتین بھی مردوں کے ساتھ برابر مدد فراہم کرتی رہی ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی پیاس بجھانے میں صفا اور مروہ کے درمیان حضرت ہاجرہ کی سعی آج بھی حج اور عمرہ کرنے والے کے ذریعہ زندہ ہے۔ یہی نہیں حضرت زینب کے ذریعہ بھی جنگ میں زخمی ہونے والے شہیدوں کی مرہم پٹی کر کے پہلی لیڈی نرس بن کر تاریخ کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ اگر ہندوستان کی بات کریں تو چاند بی بی، رضیہ سلطانہ سے لے کر جھانسی کی رانی اور بیگم حضرت محل کی داستانیں آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آزادی کی جدوجہد کے ساتھ مختلف علمی، ادبی اور طبی سرگرمیوں میں عورتوں نے اپنا اہم رول ادا کیا۔ یقینی طور پر ان کا اعتراف ہونا چاہیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذریعہ جاری شدہ ماہنامہ 'خواتین دنیا' کو بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ بلاشبہ یہ ایک قابل ستائش قدم ہے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس سمت میں پہلی کاوش ہے۔ لیکن ماہنامہ 'خواتین دنیا' کو اپنے مضامین کی وسعت اور جامعیت دیدہ زیبی اور دلکشی، معنی آفرینی اور جمالیاتی پیش کش کی بنا پر منفرد حیثیت حاصل ہے، خاص طور سے ادبی میدان میں خواتین کی نمائندگی کے ساتھ سیاسی منظر نامے میں ان کی بے مثال خدمات اجاگر کرنے میں، یہ رسالہ اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اس طرح کی کوششوں کا سب سے مفید پہلو یہ ہے کہ عورتوں کی باوقار طرز زندگی پر جو حملے ہو رہے ہیں ان پر خواتین کے ادبی، سیاسی اور قومی کارناموں کے اظہار سے ایک الگ تصور قائم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس حوالہ سے دسمبر 2017 کے ماہنامہ میں مریم مرزاخانی کے سائنسی انکشافات، افغانستان کی پہلی مسلم خاتون پائلٹ، نیلوفر رحمانی قمر جمالی کی ناول نگاری، مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے علمی ذوق جیسی اہم شخصیات کے اعتراف خدمات اور اس شمارہ میں شامل افسانوں، انشائیوں کے ساتھ خواتین کے لیے ورزش کی اہمیت، حسن کی نگہداشت، لذیذ پکوان سے ایک طرف صحت سے بیداری کی تبلیغ ہوتی ہے تو دوسری طرف حسین و جمیل بننے کے غیر صحت مند طریقوں سے احتیاط و پرہیز سے آگہی بھی۔ میرے پیش نظر نومبر اور دسمبر 2018 کے دو شمارے ہیں ان کے مشمولات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ادارہ نے خواتین سے متعلق بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح دسمبر 2018 کے ماہنامہ خواتین دنیا میں روبرو عنوان کے تحت مشہور شاعر اور افسانہ نویس بلقیس ظفر الحسن کے انٹرویو سے اہم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اسی شمارہ میں پنجابی ادب کے درخشندہ ستارے امرتا پریم، بچوں کے ادب کے لیے شاہکار خدمات کی امین 'قدسیہ زیدی'، 'اردو شاعری کی نمائندہ تانیثی آوازیں'، کے عنوان کے تحت اس سمت میں پہلی کوشش کے طور پر ادا جعفری کی خدمات کے ساتھ رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، شبنم شکیل، نوشی گیلانی، نسیم سعید، جیسی اہم خواتین کی ادبی کاوشوں پر مشتمل مضامین اہم اطلاعات کا سرچشمہ ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف افسانے تفنن طبع کا سامان ہیں اور مستقل عنوان کے تحت اس شمارہ میں لذیذ پکوان اور صحت کے کالم میں 'زیکا وائرس' سے بھی مفید معلومات حاصل ہوتی ہے۔ طب و صحت کے حوالہ سے حمل کے دوران عارض ہونے والے قبض اور اس کے علاج کی شمولیت سے رسالہ کی

جامعیت کا پتہ چلتا ہے ان رسائل میں 'مشعل' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے بھی توجہ کے طالب ہیں۔ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر عقیل احمد کے ان پیغامات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے:

''بلاشبہ خواتین دنیا ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا ہے جہاں خواتین سے جڑے مسائل پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے، لیکن ہمیں اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے نہ صرف مسائل پر گفتگو کرنی ہے بلکہ ان مسائل کے حل بھی تلاش کرنے ہیں کیونکہ حقوق نسواں کے نعرے یا مسائل پر صرف آواز بلند کرنے سے کام نہیں ہوتا بلکہ عملی اقدام بھی بے حد ضروری ہیں''۔ مدیر اعلیٰ کے اس عندیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے چند تجاویز میری بھی ہیں اس حوالہ سے میری ایک تجویز یہ ہے کہ رسالہ کو ادبی، تنقیدی اور افسانوی خول سے باہر نکال کر اس میں سائنس، گھریلو صنعتوں، سماجی تقاضوں اور سیاسی منظر نامہ میں خواتین کی نمائندگی جیسے موضوعات بھی شامل کیے جائیں، ایک اور بات جس کی طرف ذمہ داران کی توجہ چاہتا ہوں کہ کوشش یہ کی جائے کہ گھوم پھر کر محض چند مشہور ہستیوں کی شخصیت اور خدمات کو ادبی نمائندگی تک محدود نہ کیا جائے میری مراد نئی لکھنے والی خواتین ہیں جن کی ہمت افزائی بہت ضروری ہے۔ اچھا ہوگا کہ ادبی نمائندگی کے ساتھ ماضی میں خواتین کے سیاسی اور تمدنی تعاون کو بھی موضوع بنایا جائے اور نئی نسل کو کچھ ایسا پیغام دیں جو ملک، قوم اور ملت کے لیے محض ورثہ کے بجائے شاندار مستقبل کا آئینہ بن سکے۔

ڈاکٹر **سید محمد حسان نگرامی**، عقب مدح گنج پولس چوکی، سیتا پور روڈ، لکھنؤ

ایسے دور میں جب کہ قاری کا رجحان پرنٹ میڈیا سے زیادہ الکٹرانک میڈیا کی طرف ہے۔ ایسے دور میں ''ماہنامہ خواتین دنیا'' نے نہ صرف عورتوں کی ذہنی بیداری میں اہم رول ادا کیا ہے بلکہ انھیں سماجی، سیاسی، تعلیمی، تحقیقی اور تخلیقی سطح پر بھی متحرک کیا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی شرم نہیں ہونی چاہئے کہ تانیثیت کی تحریکوں کے باوجود آج بھی مابعد نوآبادیاتی معاشرے میں عورتوں کی اکثریت جبر واستحصال کا شکار ہے اور انھیں اپنے بنیادی حقوق سے بھی پامال کیا جاتا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ ضروری ہے کہ ایک پلیٹ فارم ایسا ہو، جس پر عورتوں کے مسائل پر کھل کر بات ہو سکے۔ ایسے دور میں جبکہ عورتوں کی ترقی بھی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے، جس پر متعلق مذاکرے اور سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ماہنامہ 'خواتین دنیا' اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی خواتین کی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرنے اور ان کے احساسات وجذبات کو ایک زاویہ اور ایک رخ عطا کر رہا ہے۔

شمارہ پوری آب وتاب سے لبریز ہے۔ **بلقیس ظفیر الحسن** کا دیا ہوا انٹرویو نئے لکھنے والوں کو تحریک دیتا ہے۔ ان کی ذاتی خوشی اور غم سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ عورت کے حقوق کی وکالت کرتی ہیں اور ان پر ہوئے ظلم وجبر کی پرزور مذمت کرتی ہیں جو ان کی تخلیق میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جی۔ ایم پٹیل کا امرتا پریتم پر لکھا ہوا مضمون کافی معلوماتی ہے جو امرتا پریتم کی ذاتی زندگی کے کرب کے ساتھ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار اچھے ہیں، نئے لکھنے والوں کو حوصلہ بخشتے ہیں۔ قدسیہ زیدی پر صالحہ عابد حسین کا مضمون کئی ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جہاں عام قاری کی پہنچ نہیں ہے۔ پطرس بخاری ان کے پھوپھازاد بھائی تھے اور کئی خوبیاں پطرس بخاری کی قدسیہ زیدی کے کردار میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور جس کا اثر ان کی تخلیق پر بھی رونما ہے۔ ڈرامہ نگاری کے فن میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ ناولٹ ''کوئی درد آشنا بھی نہیں'' صغریٰ مہدی کے آسان اور سلیس زبان کے ساتھ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انداز بیان پرکشش ہے اور ناولٹ کا واحد متکلم کے باوجود مکالمہ نگاری میں مصنفہ نے اپنے فن کی خوبیوں کا مکمل ثبوت دیا ہے۔ ''اردو شاعری کی نمائندہ تانیثی آوازیں'' ایک انقلابی تصور یا نظریہ ہے جو مغربی ممالک کی دین ہے۔ اس مضمون میں تانیثیت پر ادبی اثرات کے نمایاں ہونے کی بات محترمہ نیلوفر کرتی ہیں جو بہت حد تک کامیاب ہے۔ حارث حمزہ کا پروین شاکر پر لکھا مضمون بہت خوب ہے اور ان کے چنندہ اشعار مضمون میں جان ڈال دیتے ہیں۔ عشرت ناہید کا افسانہ ''چاند گرہن'' پر کیف اور لطافت کے ساتھ کرب کا امتزاج قاری کو افسانہ کے ساتھ دلچسپی سے جوڑے رکھتا ہے۔ عمومی طور پر ظاہری سے زیادہ باطنی حسن کی قدر ومنزلت کا احساس دلاتا یہ افسانہ اپنے فن پر پورا اترنے میں کامیاب رہا ہے۔ رسالے کے تمام افسانے اچھے ہیں۔ بلقیس ظفیر الحسن کی دونوں غزلیں بہت عمدہ ہیں ایک غزل کا مطلع دل کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے:

کب ایک رنگ میں دنیا کا حال ٹھہرا ہے
خوشی رکی ہے نہ کوئی ملال ٹھہرا ہے

ڈاکٹر مینا نقوی کی غزلیں بھی قابلِ تعریف ہیں اور طلعت جہاں کی نظم بھی اردو زبان وادب کی تعریف میں قابلِ تحسین ہے۔ اواخر میں ''لذیذ پکوان'' کا کالم اور ''حسن کی نگہداشت'' اس شمارہ کی خاصیت ہیں جو بقیہ رسائل سے اسے علاحدہ کرتا ہے اور خوب صورت بناتا ہے۔ اس رسالے کے متعلق تعریف اگر بیان کی جائے تو ایک طویل مضمون کی شکل اختیار کر لے گا۔

وجیتا پرویز، اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

خواتین خبر نامہ

اردو میں ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2019 ذکیہ مشہدی کو

نئی دہلی، 28 جنوری، اخبار مشرق (پریس ریلیز)۔ اردو کی ممتاز فکشن نگار اور مترجم ذکیہ مشہدی کو' آخری سلام' ناول کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے سال2018 کا ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ہوئی ایکزیکیٹیو بورڈ کی میٹنگ کے دوران ہندوستان کی 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ دیے جانے کے فیصلے کو منظوری دی گئی۔

والی بال اور باسکٹ بال مقابلوں میں ویمنس کالج کی ٹیموں نے فتح کا پرچم لہرایا

چوتھی دنیا، 11 فروری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے ویمنس کالج میں جاری چار روزہ والی بال اور باسکٹ بال مقابلوں میں ویمنس کالج کی ٹیموں نے فتح کا پرچم لہرایا۔ 13 ویں شیخ محمد عبداللہ میموریل خواتین ریجنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں ویمنس کالج کی ٹیم نے اے ایم یو سینئر سیکنڈری (گرلس) کی ٹیم کو26-18 سے شکست دی جبکہ 12 ویں اعلیٰ بی میموریل خواتین ریجنل والی بال ٹورنامنٹ میں بھی ویمنس کالج اے کی ٹیم نے فزیکل ایجوکیشن کی ٹیم پر25-22اور25-11 سے فتح حاصل کرکے خطاب پر قبضہ کرلیا۔

اختتامی تقریب میں پرو وائس چانسلر پروفیسر حنیف بیگ نے والی بال کی ٹیم کو ٹرافی سے نوازتے ہوئے کہا کہ مقابلہ میں شرکت کرنا اہم ہے۔ بلند حوصلوں کے ساتھ ٹیموں نے سخت مقابلہ کرتے ہوئے اور جیت ہار سے اوپر اٹھ کر بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا اور یہی اس ٹورنامنٹ کا حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ فتح کے بعد حوصلے بلند ہوتے ہیں لیکن ہارنے والی ٹیم کو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ نئے عزم کا اظہار کرنا چاہیے۔ باسکٹ بال مقابلہ میں فاتح اور رنرز ٹیموں کو عبداللہ ہال کی قائم مقام پرووسٹ ڈاکٹر قیصر جہاں نے انعامات تقسیم کیے۔ والی بال کی بیسٹ پلیئر کا خطاب منشا کو اور باسکٹ بال کی بیسٹ پلیئر کا خطاب جگیاسا شرما کو دیا گیا۔ اس موقع پر محترمہ عزیزہ رضوی کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسسٹنٹ

ڈائرکٹر نازیہ خاں نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

ڈائرکٹر ڈاکٹر رضیہ رضوی نے بتایا کہ ٹورنامنٹ میں باسکٹ بال کی گیارہ اور والی بال کی دس ٹیموں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر بیگم پرو وائس چانسلر، عبداللہ ہال کی قائم مقام پرووسٹ ڈاکٹر قیصر جہاں، ڈاکٹر رضیہ رضوی، نازیہ خاں، پروفیسر نکہت فیروز، پروفیسر صبا بیگ، ڈاکٹر احسان اللہ فہد، شمیم احمد، مہوش خاں، خالدہ ترنم، ندا عثمانی، ڈاکٹر فاروق اعظم وغیرہ نے شرکت کی۔ سردار حسن (والی بال) ذاکر حسین (باسکٹ بال) نے ریفری کے فرائض انجام دیے جبکہ ونشیکا کیشوانی نے نظامت کی۔

معصوم طالبہ زنیرہ فاطمہ نے جیتا گولڈ میڈل

بھوپال 29 جنوری، اخبار مشرق (مشرق نیوز سروس) عالم اسلام میں، مقبول ترین عالم دین مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ اسلامک اکادمی کرناٹک کے زیر اہتمام علمی بیداری کے تحت پروگرام چلایا جارہا ہے۔ اس

ادارے کے تحت ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ قرآن کریم میں موجود انسانی تعمیر، انسانیت کی فلاح و بہبود، انفرادی و اجتماعی زندگی کے رہنما اصول وضوابط بیان کیے جائیں۔ ساتھ ہی اس انداز میں علمی مرکزیت کو پیش کیا جائے کہ ذہن وفکر کو اپیل کرے، اس میں انسانوں کی مرکزیت کو واضح کیا جائے اور قرآن کریم کے اس دعویٰ ھدی اللناس اور بیان اللناسؑ وغیرہ کی تشریح وتوضیح ہو، اور ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جس کے اندر انسانی اخلاق کی اصلاح وبہتری، انسانیت کا احترام ومقاصد کا تذکرہ ہو اور حتی الامکان دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری اور ان مذاہب کی کتابوں کے درمیان قرآن کریم کی انفرادیت ویکتانیت کا بھی بیان ہو، اسی کے پیش نظر مختلف شہروں میں متعلقہ ادارے کے ذریعہ سے طلبا و طالبات کے درمیان مقابلہ جاتی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں جس کے تحت بھوپال میں ایک اسلامی پروگرام منعقد کیا گیا جس میں اسلام سے متعلق معلومات پر مبنی مقابلہ جاتی پروگرام عمل میں آیا۔ یہ پروگرام بروز سنیچر 26 جنوری کو ایچ ڈی ہائر سیکنڈری اسکول جہانگیر آباد میں منعقد ہوا۔ جس میں تمام طلبا وطالبات نے حصہ لیا اور اپنا عملی مظاہرہ پیش کیا۔ اس موقع پر ایک کم عمر بچی زنیرہ فاطمہ بنت سمیع اللہ نے سو فیصد نمبرات حاصل کیے جس کے لیے انھیں گولڈ میڈل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام میں موجود تمام سامعین نے معصوم ننھی پری زنیرہ فاطمہ کو دعاؤں سے نوازا، نیز ان کے روشن مستقبل کی تمنا کی۔

منیر انصاری کی پوتی نے کیا کانپور کا نام روشن

ورده نے آل انڈیا آن اسپاٹ پوسٹر کمپٹیشن میں پہلا مقام حاصل کیا

کانپور، 30 جنوری (نمائندہ): کانپور کے کہنہ مشق معروف شاعر منیر انصاری کے فرزند انجینئر تنویر احمد سینئر منیجر نیشنل ہائڈرو الیکٹرک پاور کارپوریشن (این ایچ پی سی) باندی پوروہ سری نگر کی بیٹی ورده نے آل انڈیا 'آن اسپاٹ پوسٹر کمپٹیشن' میں پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ نئی دہلی کے کناٹ پلیس واقع سینٹرل پارک میں ایف ایس ایس اے آئی کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں یونین منسٹر آف اسٹیٹ برائے صحت وکنبہ بہبود مسٹر اشونی کمار چوبے کے ہاتھوں ورده کو گولڈ میڈل اور 15 ہزار روپیوں کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ واضح ہو کہ اس مقابلے میں پورے ملک کے 3600 اسکولوں کے 75 ہزار بچوں نے حصہ لیا تھا۔ یہ ہونہار بچی شروع سے ہی فرید آباد کے ڈی پی ایس میں نمایاں کامیابی حاصل کرتی چلی آرہی ہے۔ منیر انصاری نے قدرت کے اس شاندار انعام پر بارگاہ ربی میں اظہار تشکر کرتے ہوئے مستقبل میں اس کی مزید روشن کارکردگیوں کی توقع کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

وحشت کلکتوی (مونوگراف)

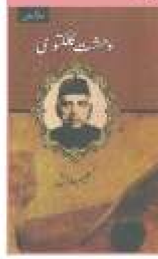

مصنف: کلیم حاذق

صفحات: 140

قیمت: 82 روپے

بیگم سلطان جہاں (مونوگراف)

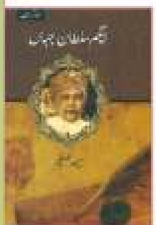

مصنف: سیما صغیر

صفحات: 144

قیمت: 83 روپے

خواجہ حیدر علی آتش (مونوگراف)

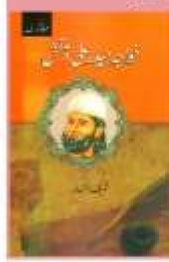

مصنف: شرف النہار

صفحات: 105

قیمت: 70 روپے

غلام رسول نازکی

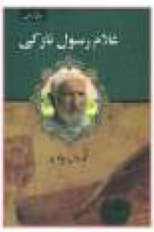

مصنف: قدوس جاوید

صفحات: 87

قیمت: 65 روپے

ساجد رشید (مونوگراف)

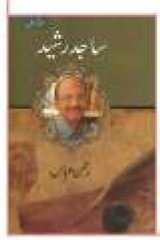

مصنف: رحمٰن عباس

صفحات: 123

قیمت: 77 روپے

رشید حسن خاں (مونوگراف)

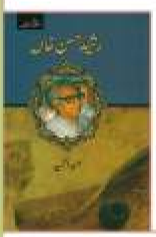

مصنف: عبدالحمید

صفحات: 122

قیمت: 75 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

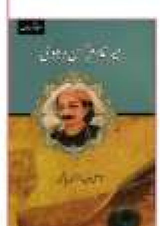

مصنف: قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

صفحات: 126

قیمت: 77 روپے

حسن نعیم (مونوگراف)

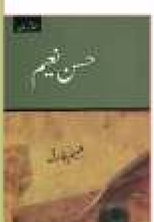

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 143

قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2019, Vol. 03, Issue: 3
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025